

کالائپنی

Rashid Ashraf
zest70pk@gmail
l.com

مُصَنَّف: مولانا محمد جعفر تھانوی



مکتبہ اہلحدیث ٹرسٹ رجسٹرڈ

اہلحدیث چوک، کورٹ روڈ، کراچی، فون : 2635935

کالایانی

طاہر

مصنف

مولانا محمد جعفر نقوی

ناشر

مکتبہ برسات اہلحدیث

کورت روڈ، کراچی

فہرست

| | | | |
|----|---|----|-----------------------------|
| ۶۶ | مقدمہ از حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب سلفی | ۶۷ | سزا کا فیصلہ |
| ۶۹ | سختی کے گھنٹے - از محمد خالد میمن | ۷۰ | چیف کورٹ میں اسپیل |
| ۷۱ | پیش لفظ | ۷۲ | قاضی میاں جان کا انتقال |
| ۷۳ | محرک امبیلہ | ۷۴ | آباد والدہ مرحومہ |
| ۷۵ | مازسش کا انکشاف | ۷۶ | جیل کی مشقت |
| ۷۷ | منہار | ۷۸ | سات سات باتیں |
| ۷۹ | علی گڑھ میں گرفتاری | ۸۰ | مولانا احمد اللہ کی گرفتاری |
| ۸۰ | جیل میں ناقص خوراک | ۸۱ | اہل و عیال کی طرف روائی |
| ۸۲ | استحباب عشق | ۸۳ | سیمنڈل جیل لاہور |
| ۸۴ | دہلی سے انبلا تک | ۸۵ | ایک قیدی کا اعلیٰ کردار |
| ۸۶ | قداروں پر فوازشیں | ۸۷ | کراچی کوروانگی |
| ۸۸ | شیخ الکمل میاں نذیر حسین کی طلبی | ۸۹ | مستان میں |
| ۹۰ | ہمارے ہندوستانی مسلمان | ۹۱ | کراچی جیل میں |
| ۹۱ | مقدمہ انبلا | ۹۲ | صبح سفر شام سفر |
| ۹۲ | پرامیس تشدد کی ایک مثال | ۹۳ | کالا پانی کوروانگی |
| ۹۳ | بھائی کا بھوٹی گواہی سے انکار | ۹۴ | مولانا احمد اللہ سے ملاقات |
| ۹۴ | مقدمہ پیشین سپرد | ۹۵ | جزائر اندمان |
| ۹۵ | مولانا یحییٰ علی کی صحبت | ۹۶ | پیداوار اور آب و ہوا |
| ۹۶ | مقدمہ کی پیروی | ۹۷ | اندمان کی فوج آبادی |
| ۹۷ | شرچاؤن کے قانونی نکات | ۹۸ | اصلی باشندے |

کتاب کالاپانی
مصنف مولانا محمد جعفر نقاشانی

ناشر
مکتبہ ٹرسٹ اہل حدیث

کورٹ روڈ، کراچی
تعداد ۵۰۰

تقریب اشاعت

زیر نظر کتاب "کالا پانی" تحریک احیائے دین امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت امام محمد اسماعیل شہیدؒ کی ایک دہشتہ ترین جھلک ہے۔ اس کی اشاعت سے مقصد صرف یہ ہے کہ شاید اس کے مطالعہ سے مملکت خداداد پاکستان میں محمدی انقلاب برپا کرنے کے مقدس ترین فرض سے عہدہ برآ ہونے کی سعادت کسی بھائی کو نصیب ہو جائے۔

تاریک شب ہے جد اپنے قافلے سے ہے تو تیرے لیے ہے میرا شعلہ نوا قندیل

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے ہماری لغزشوں کو معاف فرماتے ہوئے ہیں بھی اس مقدس ترین نصب العین میں کامیابی و کامرانی سے سرفراز فرمائے۔

ما بک روحاں بامید شہادت زندہ ایم
در خیال ما حیات جاوداں گراں باشد

حضرت سید عمر فاروق غزنوی زید مجدہؒ نے بھی جو اپنے مرحوم بھائی حضرت سید ابو بکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اپنے دل میں احیائے دین کی تڑپ رکھتے ہیں — کئی مرتبہ فرمایا کہ میری تمنا ہے کہ "کالا پانی" کو شہید اکیڈمی کی طرف سے شائع کیا جائے، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور ہم اسے لیے ذریعہ نجات بنائے۔

محمد سلیمان عفی عنہ بن امیر المجاہدین مولانا فضل الہی وزیر آبادی
نامزد جانشین حضرت امیر المجاہدین عارف باٹ
صوفی محمد عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ
جامعہ تعلیم الاسلام ماہرہ کالج

| | | | |
|-----|------------------------------|-----|------------------------------|
| ۱۲۰ | مجاہدین اور سرکار ہند | ۹۵ | مذہبی خیالات |
| ۱۲۱ | پٹنہ اور بنگال میں گرفتاریاں | ۹۶ | سماجی زندگی |
| ۱۲۲ | ہنر کی کتاب | ۹۹ | جنگ آزادی کے قیدی |
| ۱۲۶ | مولانا احمد اللہ کا انتقال | ۱۰۱ | شادی خانہ آبادی |
| ۱۲۸ | رائی | ۱۰۲ | سرفنا عبد الرحیم |
| ۱۲۹ | روانگی کے انتظامات | ۱۰۳ | تین ملک حادثے |
| ۱۳۰ | تعصب کی انتہا | ۱۰۴ | بیوی کا انتقال |
| ۱۳۱ | انڈمان کا انتظام حکومت | ۱۰۵ | دوسری شادی |
| ۱۳۲ | قیدیوں کے لیے قوانین | ۱۰۸ | ایک جھوٹا مقدمہ |
| ۱۳۳ | مختلف اقوام اور ان کی معاشرت | ۱۰۹ | عید الاضحیٰ کے موقع پر جھگڑا |
| ۱۳۵ | الوداعی منیافت | ۱۱۰ | ہندوؤں کی سازشیں |
| ۱۳۶ | مولانا لیاقت علی آبادی | ۱۱۲ | مولانا محمد حسن انڈمان میں |
| ۱۳۷ | ہندوستان کو روانگی | ۱۱۳ | لارڈ میو انڈمان میں |
| ۱۳۸ | تھانیر | ۱۱۴ | لارڈ میو کا قتل |
| ۱۳۹ | انعامات الہی | ۱۱۵ | شیر علی تختہ دار پر |
| ۱۴۰ | ریاست ارنول میں ملازمت | ۱۱۶ | ایشوری پرشاد کی سازشیں |
| ۱۴۱ | مکمل آزادی | ۱۱۷ | انگریزی زبان کی تعلیم |
| ۱۴۲ | خاتمہ | ۱۱۸ | مغربی علوم کا مجدد اثر |

مقدمہ

الحمد لله رب العالمين والصلوة على انبيائهم سيما الخاتم لهمم والسلام على
الاتقياء البررة السكرميين الى يوم الدين۔

پیش نظر کتاب مولانا محمد جعفر تھانیسری مغفور کی خود نوشت سرگزشت ہے۔
اس کتاب میں متعدد مقامات پر دہابی یا اہلحدیث کا تذکرہ ملے گا۔ "دہابی" کا لفظ تو سرکار
انگریزی کا خود ساختہ ہے۔ اہل توحید نے ان شخصوں کو اپنے لیے کبھی پسند نہیں کیا البتہ اہل
حدیث کے لفظ کو اپنے مسلک کے لحاظ سے عزور پسند کیا گیا۔ اس وقت میں نہیں کہہ سکتا کہ جماعت
کی اس لفظ سے متعلق کیا پوزیشن ہے لیکن اصل وضع کے وقت یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ اس لقب کے
ساتھ نظر و فکر کے ان سکول سے اجتناب مقصود تھا، جو جو تقلیدی کے ترجمان تھے اور اس فرقہ پروری
کے سبب اسلام پر کئی حد بندیاں لگادی گئی تھیں، جن کو عبور کرنا ترک اسلام کے مرادف یا کم از کم
فسق و معصیت سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ اسلام نے سب سے بڑی نفی جو اپنے متبعین کو عطا فرمائی
تھی، وہ یہی قرینہ فکر تھی اور آبار و اجداد کی رسوم اور پابندیوں سے نجات۔

پہلی صدی کے ادوار اور دوسری صدی کے ادوار میں جو بہت سے مقاصد اور ضروریات پیدا

۱۹۲۷ء۔ (۱۳۴۷ھ) کی بات ہے جب خاکسار فیروز پور (مشرقی پنجاب) کی جامعہ اہلحدیث
گنبدان والی میں مقیم تھا کہ مولانا محمد جعفر تھانیسری کی مشہور کتاب "تاریخ تجلیہ" (کالاپانی) کو عمدہ طریقہ
سے شائع کرنے کا ارادہ ہوا تھا، جس پر مقدمہ لکھوانے کی درخواست حضرت مولانا محمد اسماعیل (جو جرائد
رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں کی گئی۔ مرحوم و مغفور نے حسب عادت قلم برداشت نہایت فاضلہ مقدمہ مرتب
کر کے بذریعہ ڈاک فیروز پور رسل فرادیا تھا لیکن افسوس! جو وہ کتاب مذکور کی اشاعت کی نوبت آئی

۶
ہو چکی تھیں۔ تاہم قتل و دانش اور فہم و فراست کے کھلے اور وسیع دروازوں پر یہ قتل نہیں ہو
تھے، جو چوتھی صدی ہجری کی پیداوار ہیں۔ پہلی صدی ہجری میں محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے رفقاء کا وہ
رہو جس نے سب سے پہلے کراچی کے راستہ ساحل (مقعدہ) ہند کو عبور کیا، ایسے مقدسین پر مشتمل تھا
جو اسلام کے آب زلال کو اس کے اصل حرمینوں سے حاصل کرنے کے عادی تھے۔

اس کے بعد علم کی کمی اور زمانہ نبوت کے بعد نے فرقہ پرستی کا یہ ٹھسہ پیدا کر دیا، جس
میں آج کل ہم مبتلا ہیں اور بے حتی کا یہ عالم ہے کہ خود اس جو جو تقلید پر فخر کرتے ہیں، علمائے امت
اور ائمہ اصول و تجدید کے متعلق یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ بھی ہماری طرح قائلین

۱۹۴۷ء میں پاکستان آنے پر جو مختصر سے چند کاغذات راقم کے ساتھ آئے (ہزاروں کی قیمت
اور نادر ذاتی کتب اور بعض ضروری کاغذات تو وہیں فسادات کی نذر ہو گئے) ان میں خوش قسمتی سے حضرت
کایہ "مقدمہ کالاپانی" بھی تھا۔

گزشتہ دنوں اتفاقاً معلوم ہوا کہ طارق اکیڈمی کے زیر اہتمام کتاب "کالاپانی" کا
بازہ ایڈیشن نہایت احسن انداز میں زیر طباعت سے آراستہ کیا جا رہا ہے لہذا اب یہ مبدک مقدس اس
کے ساتھ شامل ہے۔ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شیعی قدرًا۔

واضح رہے کہ یہ نگارش ۳۵ سال پہلے کی ہے جبکہ اگرچہ انگریزی راج کے آخری سال تھے،
تاہم بھلائی استبداد موجود تھا جس کی طرف مقدمہ میں قدسے اشارات ہیں نیز ان ہی دنوں ایک دیوبندی
سیاست دان مولانا نے "علمائے ہند کا شاندار ماضی" نامی کتاب تالیف فرمائی تھی جس میں نہ صرف
کہ "علماء" کو اپنے حق اپنے حق کے فقہائے اصناف کو دیا گیا بلکہ "شاندار" کا کرڈٹ بھی۔ چونکہ
اس کتاب کی تالیف کے زمانے میں بھی جماعت اہل حدیث تقریباً آزادی وطن کے سلسلے میں حضرت
مقدمہ نویس اور مولانا ابوالقاسم بندہ کی قیادت میں ملک کے دیوبند کے دانشورین سرگرم مل تھے، اس
لیے مولانا محمد اسماعیل مرحوم و مغفور کو دیوبندی مولانا کی طوالت مقدمہ تدریج نویسی سے وہ پہنچا کرتی تھی، جس کا

تھے اور کتاب و سنت سے استدلال کی جرأت نہیں فرماتے تھے، پھر اس کے لیے ایسے حیل اور تدبیرات پیدا فرماتے ہیں کہ جس سے ان حضرات کو بھی حیل کے فن کا مجتہد منہم کہنے کو جی چاہتا ہے۔ حیب اور اس کا صدمہ احساس بلکہ عیب پہ خیز ایسے امراض ہیں، جن پر امت کو ناز نہیں ہو سکتا بلکہ مذمت سے سر جھک جاتا ہے اور اصلاح حال کا دلولہ، یاس اور ناامیدی کا پیکر بن کر رہ جاتا ہے۔

مصلحین کی مساعی ہر صدی میں ایسے لوگ موجود رہے جو وقتی خرابیوں کو دیکھتے اور ان کے بے قرار دل، ان کی اصلاح کے لیے بے تاب ہو جاتے حدیث "لا یزال ملئفة من امتی" کا مقتضی بھی یہی تھا۔ ان تمام بزرگوں کا تذکرہ قید سنیں اس مختصر سی تحریر کا موضوع نہیں لیکن تاریخ کا ادنیٰ طالب علم آسانی سے یہ بیان سکتا ہے کہ مصلحین، حسب حال ان تباہیوں کی زد کو محسوس کرتے رہے اور اس راہ میں ہجرت اقلیدہ بلکہ دار و رسن تک کی صعوبتیں برداشت فرماتے رہے۔ حضرت امام مالکؒ، حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام سفیان ثوریؒ وغیرہ اللہ اسلام ایک ایک اس

خفیہ سا ذکر مقدم میں ہے جس میں ان کو حق بجانب سمجھا جائیے۔

افسوس! مقدم میں مذکور تقریباً "بھی حضرات جناب مقدم نویس کی طرح آج ہم میں جو نہیں رہے۔ نام اللہ کا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

حاکم محمد عطار اللہ صلیت بعد جانی

ناظم المکتبۃ السلفیۃ، لاہور

غزوہ محرم ۱۳۹۶ھ

ملہ ملاحظہ ہو "العرفان" بریلی کا شاہ ولی اللہ نیر مری خیر محمد جالندھری کا مضمون "شاہ ولی اللہ صلیت تھے" (راہ ص ۱) رہے کہ سلفانہ مروج کی یہ تحریر اس زمانہ کی ہے جن دنوں یہ محولہ نیر شائع ہوا تھا۔ (ج ۱، ج ۲)

کی نظیر میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

سنت الہی گیارہویں صدی ہجری کے اواخر میں حق و باطل کی آویزش نے ایک ایسے مرکز کی صورت اختیار کر لی تھی کہ کفر و فسق کے شیوع اور تعلیمات اسلامی کے انحطاط نے دنیا سے ہست و بود کو ظلمت کدہ بنا دیا تھا، غرور اور بدعت کے بادل اس قدر محیط تھے کہ حق و صداقت کی کسی ہلکی سی کرن کے ظہور کو بھی امید نہیں کی جا سکتی تھی لیکن سنت الہی کے مطابق مختلف مقامات میں مصلحین امت کا ظہور ہوا۔ عرب میں یہ شرف خطہ نجد کو ملا اور حضرت شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ تعالیٰ کا انتخاب عمل میں آیا۔ گو یہ تحریک سیاسی نہ تھی، اصلاحی تھی لیکن بتدریج سیاسی ہو گئی کیونکہ اسلام کا نظام ہی ایسا تھا کہ وہاں سیاسیات سے الگ رہ کر کسی کامیاب اصلاح کی توقع ہی نہ تھی۔ یہ تحریک "وہابی تحریک" کے نام سے عرب میں کافی کامیاب ہے۔ اہل نجد اسی نام سے پکارے جاتے ہیں اور اسے شاید اپنے لیے پسند بھی کرتے ہیں۔ اس وقت اس تحریک کو عرب میں علمی اور سیاسی اقتدار حاصل ہے فالجہم اللہ علی ذلک۔

دوسری تحریک دوسری تحریک الجزائر اور ٹیونس میں شروع ہوئی جو "سنوسی تحریک" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ تحریک فرانس کے مظالم اور استبداد کی بدولت شروع ہوئی۔ سنوسی خاندان نے اس کی رہنمائی کی۔ گو یہ تحریک کھلے طور پر کامیاب نہ ہو سکی لیکن اس کے بیچ اس قدر گہرے ہوتے گئے کہ بالآخر فرانس کو لے ڈوبے۔ ملک کی اسی اندرونی تاریکی نے ہٹلر کے مقابل فرانس کو چست گرایا اور ملک سے اسے کوئی امداد مل سکی، اس کی تفصیلات ہمیں نہیں مل سکیں اور نہ ہی اس وقت وہ مطلوب ہیں۔

تیسری تحریک تیسری تحریک کے بانی حضرت شیخ جمال الدین افغانی ہیں۔ اس کی ابتدا ایران سے ہوئی، ہندوستان بھی اس سے متاثر ہوا بلکہ مصر، قسطنطنیہ اور یورپ تک اس کے اثرات پھیلے۔ آج بھی مصر میں زندگی کے آثار اسی کے سبب پائے جاتے ہیں۔ شیخ محمد عبدہ، سید رشید رضا اور شیخ مراغی اسی تحریک کے

مذاہقین سے ہیں جنہوں نے اپنی عمریں یورپ کے سیاسی اقتدار کے خلاف اور مانہ المسلمین کی اصول میں صرف فرما دیں۔ غرض مصر کی ساری بیداری شیخ جمال الدین اور ان کے تلامذہ کی مساعی سے ہے۔ شکر اللہ مساعیہم

چوتھی تحریک اصلاح

منزل حکومت پہلے بھی کوئی خالص اسلامی حکومت نہ تھی، اس کے نظام میں غیر اسلامی اثرات بہت زیادہ تھے۔ اپنے عروج کے زمانہ میں بھی یہ حکومت مروت اور شیعت کے اثرات سے مرکب تھی، اب اشتنا۔ ایک دو کے عموماً بادشاہ جاہل تھے، ان کی ہوا پرستیوں کے ساتھ علماء سور کے تعاون نے حالات کو بد سے بدتر کر دیا تھا۔ علماء حق کو اس نظام سے صرف اسی قدر دلچسپی تھی کہ بادشاہوں کے نام مسلمانوں سے ملنے جھٹلتے تھے۔ کبھی کبھار عید اور جمعہ کی نماز میں شریک ہو جاتے تھے، اس کے سوا وہاں اسلام کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔

اسلام کے اس ظاہری اقتدار کے سبب علماء حق ان سلاطین کے خلاف کوئی کھلم کھلا قدم اٹھانا پسند نہ فرماتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ معاملہ دماغ و مروت اور انہماق تعمیر سے ہو جائے اور یہ سلاطین صحیح طور پر اسلامی نظام کی ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لیں۔ لیکن سلاطین کے لیے ناممکن تھا کہ وہ کسی اصلاح کو آسانی سے قبول کر لیں یا مجبور و معصیت کو صرف علماء حق کی آرا منگی یا نصیحت سے چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں۔

جولان الدین اکبر اور اس کے رفقاء کی مفسدانہ مساعی اور اہل حق کی ذہنی تخریب دین کے لیے منصوبے اور حیاتیوں کی طرف کھلا ہوا ہجمان، یہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا تاریک ترین اور کھلا ہوا باب ہے۔ جہاں شیخ محمد طاہر ٹنوی ایسے اہل اللہ کی پیشین گوئی

۱۰ سید محمد جوہوری کی طرف منسوب - ج ۱

۱۱ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی لفظی ساری عمر ایسی ہی کوششوں میں صرف فرمادی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

نہ دوسرے اہل حق کی، وہاں اگر جادو چلا تو خانوادہ قلمبارک کا اور بس۔ فیحق اللہ۔

حضرت شاہ ولی اللہ

ان انگریز حالات کی بدولت قانون الہی کے موافق علماء اعلیٰ کی رحمت بھری نگاہیں اس ظلمت کدہ کی طرف متوجہ ہوئیں اور خانوادہ قلمبارک کی نجاستوں کو دور کرنے کے لیے ان کی بجا حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے تاندان نے لے لی۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ قلمبارک کا تاندان بیواں اللہ اکبر کے زیر سایہ تھا اور شاہ عبدالرحیمؒ کے تحت بگر پر سر نہا کا سایہ۔ ابوالفضل اور فیضی کی بھوک پیاس کا علاج شاہی محلوں اور اکبر کے قانون میں تھا اور اس تاندان کی ضروریات اور رومانی پیاس کی سیرابی کا سامان حجاز و طیبہ میں۔ فشتان ما بینہما۔ یہ لوگ یوں خیری سے اتنے ہی بے نیاز تھے، جس قدر خانوادہ قلمبارک ابوانؒ خداوندی سے اسی لیے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تحصیل علوم کے بعد درس حدیث کے لیے حجاز کا رخ کیا اور فنون حدیث کا ایک شیش بہاؤ خیرہ حجاز سے ہندوستان کے لیے لے گئے اور سابقہ درسیات کے ساتھ درس حدیث کو خاص اہمیت دی اور عمر کا باقی حصہ اسی راہ میں ختم فرمادیا۔

ملاق در حق مدرسہ وقیل و قال درس

اینها بجا ک کوئے تو مادر نہ سادہ ایم

حضرت شاہ صاحبؒ کی عمر حسب بیان حضرت نواب صدیقی حسن خاں مرحوم (ابجد العلوم) ۱۱۱۳ قریباً ۶۹ سال (پیدائش ۱۱۴۴ اور وفات ۱۲۱۳) ہوتی ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان میں طوفانی انقلابات کا ہے، بیسیوں قوتیں دہلی کے تخت کی آرزو میں بساؤ سیاست پر آئیں اور کامیابی یا ناکامی کے ساتھ ختم ہوئیں۔ بیٹوں نے اپنی سیاسی مصالحت کی بنا پر باپ سے نفرت کی، بھائی بھائی سے لڑا۔ غرض اس عرصہ میں قریباً دس بادشاہ دلی کے تخت پر قابض ہوئے اور اسے چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے ایام میں بھٹانوی عتاب تحت دہلی پر قابض ہونے کے لیے منل بادشاہوں سے گھوڑیاں لے رہا تھا کہ ایک حد تک

اس کا پٹنگل اس شکار پر پڑی چکا تھا یہ تو نا ممکن ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ ایسا بصیرت آہ ان حوادث سے متاثر نہ ہو یا وہ ان نتائج سے بے خبر ہو۔ جو ان انقلابات کے بعد ان کے پردہ پر پڑ سکتے تھے۔ جس کی تکمیل کی ذمہ داری حضرت شاہ صاحبؒ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ٹھہری گئی تھی، جس کا تذکرہ حضرت شاہ صاحبؒ نے "تغیبات" میں بدجا اشارہ و صراحت کیا ہے۔

شاہ صاحبؒ کا انداز اصلاح | شاہ صاحبؒ کی مثال ان حوادث میں اس پناہ کی طرح ہے جو سمندر کے کناروں پر واقع ہو۔

سمندر کی موجیں اسے بار بار پھیرتی ہیں لیکن اس کے سکون میں کوئی جنبش نہیں پیدا کر سکتی اس کے وقار میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ اضطراب بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ شاہ صاحبؒ کی تصانیف میں ان حوادث سے کوئی بے قراری یا قلق محسوس نہیں ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک کوہ وقار جبل اپنی اور دشمن فوج کی ساری حرکتوں کو دیکھتا ہے، ناگزیر حالات کو سہارتا ہے اور اپنے پردہ پر گراہی تکمیل کے لیے بڑھا جاتا ہے۔ "حجۃ اللہ البالغہ" کے ابواب میں خلافت الہی کی تائیس اور تکمیل کے لیے جو ناکر بنایا گیا ہے، اس میں بدرجہ رنگ بھرا جائے گا اور اس ارادہ کی تکمیل ٹھیک اسلامی تعلیمات کے زیر سایہ ہوگی۔ اس کے لیے زعفران بکیر کا ارتعاش مطلوب ہے، نہ "زندہ باد" کی ہنگامہ آرائی۔

مقابل کی صفوں میں سے جہاندار شاہ ہوا فرخ سیر کوئی بھی اگر مقاصد سے گرانے کے لیے آمادہ ہو تو ایک تبسم آمیز بے نیازی کے ساتھ اس کی دعوت مبارزت قبول فرمائی گئی ہے، لیکن اس سیاسی انہماک نے مسلمانوں کی اندرونی بیماریوں سے ایک منٹ کے لیے بے پردہ نہیں کیا۔ "فتح الرحمان" کی اشاعت، درس حدیث اور رد بدعات کا ہر سلسلہ ساتھ ساتھ جاری رہا ہے۔ "حجۃ اللہ البالغہ"، "تغیبات" اور "البلاغ المبین" آپ کی تصنیفات پڑھنے والے ان محاذوں کو خوب پہچانتے ہیں، جن پر مجید وقت رونا تھا۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ | ۱۱۷۰ھ میں حضرت مجدد وقت شاہ ولی اللہؒ کی وفات کے بعد یہ ساری ذمہ داریاں شاہ عبدالعزیزؒ

صاحبؒ کے حلقہ میں آئیں۔ آپ کے دور میں ان مقاصد کے تین شعبے ہو گئے۔ سیاسیات وطن درس و تدریس اور پند و موعظت اور ہر شعبہ حسب رجحان طبیعت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ کے حلقے میں آیا اور ہر ایک نے ذمہ داریاں اپنی افتاد طبیعت کے مطابق اٹھائیں، تاہم معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سب کارگزاریوں کی نگرانی خود فرماتے اور حسب ضرورت ہدایات دیتے تھے۔

خاندانِ دہلی اور حنفیت | فروغِ فقہیہ میں حنفی مسلک کا التزام خاندان میں حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے زمانہ سے ہی اٹھ چکا تھا بعض مشہور

مسائل میں وہ حنفی مسلک کے پابند نہ تھے۔ جیسے قرأت فاتحہ خلف الامام، چنانچہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ نماز جنازہ اور دوسری نمازوں میں اس کا التزام فرماتے تھے۔ شاہ ولی اللہؒ نے یہ فقہ اور بھی عریاں کر دیا؛ چنانچہ مولانا شاہ محمد فاخر زائر آبادیؒ کا درود دہلی، آمین بالجہر کی نزاع اور شاہ صاحبؒ کا فیصلہ مشہور واقعہ ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے فتووں میں بھی فاتحہ کے متعلق مسلک شافعی کی مکمل حمایت پائی جاتی ہے (ملاحظہ ہو فتویٰ مطبوعہ کلکتہ) حضرت شاہ محمد حنیف شیدؒ نے تقلیدِ جابر کے اس پہلو کو بالکل ہی بے نقاب کر دیا۔ "تنویر العینین فی اثبات دفع الیہ" میں "مکمل حنفی مساک" کی حمایت سے بالکل دستکش ہو گئے اور رفع عند الکون و بعد الکون کو ترک رفع پر ترجیح دی جیسے حضرت شاہ ولی اللہؒ بھی حجۃ اللہ البالغہ میں ظاہر فرماتے تھے (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۸)

اعظم حقیقت | اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ میں حنفی مسلک کے پورے پابند بھی تھے، سید احمد شہیدؒ کے لشکر میں دونوں فریق یا دونوں مساک کے آدمی دوش بدوش سکھوں سے لڑتے تھے اور آپس میں ان مسائل پر کوئی ادنیٰ سی مخالفت یا آدیش بھی نہ ہوتی تھی اور حق بھی یہی ہے معاملہ ایک سنت پر عمل یا اس کے ترک سے زیادہ نہیں اور نہ ہی سننی اور اہل حدیث میں کفر و اسلام کا فرق ہے (تقلید شخصی پر مجبور سے قطع نظر) ایسے اختلافات سلف سے خلف تک موجود

رہے ہیں۔ ان اختلافات کی بنا پر نہ کسی کی تفسیر میں آئی نہ تفسیق شخصی اجتہاد یا ترجیح سے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ ہر ایک اپنی تحقیق اور صواب دید پر عمل کرنے میں آزاد تھا۔ ایک عجیب حقیقت ہے کہ اس قریب میں اکثریت علماء کی تھی یہ کہ جنگ کے بعد انگریز سیاست میں بھی مجاہدین کو الجھنا پڑا۔ انگریز شاہی ان غلطیوں میں ایسے اختلافات پیدا کرنے سے قاصر رہا۔ یہ سب علم و دانش کی برکت تھی کہ اختلاف کے باوجود وحدہ اختلاف کو سمجھا گیا تھا۔ یہی ایک نقص ہے جسے آئی ہم اپنے اختلافات میں نہیں سمجھ رہے ورنہ وہ کون سا زمانہ ہے جس میں اختلاف خیال موجود نہ تھا اور یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کی دماغی قوتیں ایسی مستوی سطح پر آجائیں جہاں یہ فروغی اختلافات سرے سے ناپید ہی ہو جائیں۔

تحریک اصلاح و جہاد کا مقصد (مقدمہ) ہندوستان میں اس تحریک کے مؤجدین کے سامنے بنی مقصد تھے۔

(۱) آزادی فکر، تعلیم و تہذیب سے بچ کر کتاب و سنت سے براہ راست اصول و فروع دینیہ کے سمجھنے کی کوشش کرنا اور ان تالوں کو توڑ دینا جو اس موجد الہی کے دروازوں پر لگائے گئے تھے، جسے عقل و دانش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(ب) بدعات و محدثات کی مخالفت کرنا اور اسلام کی اس سادہ صورت کو سمجھنے اس پر عمل کرنے کی کوشش کرنا، جو قرونِ اولیٰ میں موجود تھی اور جس پر سلفِ اول نے عمل کر کے کامیابی حاصل کی تھی۔

(ج) دنیا میں حکومتِ ملکیہ قائم کرنا اور سیاست کے منہ کو اس طرح بدل دینا کہ اسلامی نظام قائم ہو کر نہ کسی ایک طریقہ سے جس سے دنیا کے مختلف مذاہب، صیغہ امن و مہین اور مذہبی آزادی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

شاہ محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ اسماعیلؒ کے مدظلہ دہلی کے بزمِ اہل کی مجلسوں سے لے کر بالاکوٹ کے اس غنی

محرک تک جو حق و باطل کی آویزش میں اس نئی کا آخری میدان کارزار تھا، بحقیقت نمایاں ہے کہ توحید کی اشاعت، سنت کی ترویج، بدعت کی مخالفت، شرک اور اس کی اسلام سے جنگ اور ہر فریضہ شریعی تعلیم کے بدلنے کے لیے کتنے مضبوط ارادوں اور اس راہ میں ستم عمل سے کام کیا گیا ہے اور اس بے جگری سے کہ دنیا پر اسباب سے دیکھ کر عقل و دانش کی راہ سے امن و تباہی کا محاسبہ کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ رضی اللہ عنہم وارضاهم۔ ایمان صیغہ اور غلوں کی اصل ہی ایسے ذرائع ہیں جن سے اس قریب اور اس کے محرکین کو بچنے میں مدد ملتی ہے۔

بنا کر دند خوش رسے بجاگ و خون غلطیوں

خدا رحمت کند ایس عاشقان پاک طینت را

ایک غلطی کا ازالہ مجھے ان جگہوں کی تفسیلات میں نہیں بانا ہے کہ سکھوں کو کہاں شکست ہوئی اور مجاہدین کہاں کہاں کامیاب ہوئے بلکہ

مجھے اس غلطی کو اٹھانا ہے جو حیاتِ طیبہ کے مصنف اور اس قسم کے ڈرپوک لوگوں نے اس تحریک کے متعلق پیدا کر دی ہے کہ بانیانِ تحریک کا مقصد صرف سکھوں کے مظالم کو ختم کرنا تھا انگریزی حکومت سے امن کی سطح تھی بلکہ انگریزی مظالم ان کی نگاہ میں قابلِ مواخذہ نہ تھے۔ تحریک کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار تحریک پر سب سے بڑا غلطی ہے۔ سلاسل کا سرکرہ بس میں ہونا مقصود ملی، مولانا عبد اللہ بن مولانا ولایت علی صاوقی کی قیادت میں شریک تھے جس میں انگریزوں کی طرف سے جنرل نیوی میرس انگریزی عساکر کی قیادت کر رہے تھے۔ یہ محرک قریباً چھ ماہ تک جاری رہا۔ ہنزہ نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ اس معرکہ میں انگریزوں کے قریباً پانچ ہزار آدمی کام آئے اور اسی لڑائی کے نقصان سے جو انگریزوں کو ان خانہ بدوش لوگوں کو خواہ مخواہ چھڑ کر ہوا اور ڈائمن رائیفرائے ہند چنبے کی پھاڑیوں میں حرکتِ قلب بند ہونے سے مر گئے۔ اس کا تذکرہ مولانا تھانیسری نے ”کالا پانی“ کے شریعہ ہی میں کیا ہے اور مولانا

مجتہ "النسیار" کا حضور ہند اشعنان مسکنہ میں اس سی پوری تفصیل موجود ہے۔ اس کے بعد متواتر واقعات ہوتے رہے، جن میں اس لشکر کے بقیۃ السیف انگریزی مظالم سے اس طرح لڑنے جس طرح وہ سکھ مظالم سے نبرد آزما ہوئے تھے۔

پیش نظر کتاب میں بھی ان کوششوں کے پس منظر کا تذکرہ ہے جو ان مسلم مجاہدین نے اس راہ میں کیں۔ چٹنہ کے دہائی کیس کی یہ سرگزشت ہے جو پھانسیوں یا جھور دریائے سوار کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ مولانا جعفر تھانیسری نے جس سلاست سے ان واقعات کو بیان کیا اور جس سادگی سے اس داستان کو دہرایا ہے وہ اپنی صداقت کی آپ گواہ ہے، اس میں جماعت اہل حدیث کی ان مساعی کو واضح کر دیا گیا ہے جو انہوں نے تخلص وطن کے باب میں کیں۔ فجزاھم اللہ عنا وعن المسلمین احسن الجزاء۔

درس و تدریس اور تحریک جہاد

تحریک کا شعبہ جہاد جس کی ذمہ داریاں مولانا شہید کے پردھتیس بے حد خطرناک تھیں۔ نہ سکھ بڑداشت کر سکتے تھے اور نہ انگریز۔ اس لیے شہید کے بعد وہی الہی وستان کا ایک معتد بہ حقہ صرف درس و تدریس، وخط و خطابت اور شرک و بدعت کی تردید کی طرف غائب ہو گیا اور استخلاص وطن کے لیے کسی دوسرے وقت کا انتظار کرنے لگا۔ اور اپنے مسلک کے موافق دیوبند، سہارنپور اور دہلی میں فقہ و حدیث کے مدارس کھول کر کتاب و سنت کی اشاعت میں اپنے اپنے طریق پر مشغول ہو گئے، دونوں جماعتوں میں فردعی اختلاف مزور تھا لیکن عناد اور شقاق بالکل نہ تھا۔

شیخ الکل مولانا سید محمد نذیر حسین کی درس گاہ حدیث

اس زمانے میں دہلی کی درس گاہ و بابیت کے نام سے زیادہ جانا جاتی ہے کہ یہ لوگ اس طرح رسوم میں یا عریاں اور بے حجاب تھے۔ نیز اس شغل کے باوجود ان لوگوں نے شرعی نظام کے قائم کرنے اور

خلافت نظام کے توڑنے میں اپنی کوششوں کو کسی نہ کسی صورت میں جاری رکھا اور اصحاب دیوبند وغیرہ اس فرض کی ادائیگی میں محتاط بلکہ خاموش ہو گئے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں آپ کو اس دور کی اس تحریک کے تذکرہ نگار غالباً تمام کے تمام اہل حدیث ملیں گے بعض لوگ مثلاً مولانا محمد میاں مراد آبادی مؤلف "علماء ہند کا شاندار ماضی" اسے اتفاقی چیز سمجھتے ہیں لیکن یہ صرف اتفاق نہیں بلکہ واقعات کا صحیح نتیجہ ہے یعنی شہید کے بعد ایک گروہ مزدورت سے زیادہ محتاط ہو گیا اور دوسرا گروہ خدمتِ علم کے ساتھ استبداد کی مخالفت بھی کرتا رہا۔ اس لیے کچھ حنفی حضرات نے (بریلوی اور لدھیانوی قسم کے) اور کچھ برطانوی حکومت کے ارباب بسط و کشادہ نے اس جماعت (اہل حدیث) کو بدنام کیا۔ چنانچہ یہی لوگ "وہابی مقدنات" میں گھیسے گئے چنانچہ اسی کتاب کے صفحہ پر مرقوم ہے کہ "مولوی نذیر حسین صاحب جن پر واسطے اظہار تمام کل ممبران اہل حدیث باشندگان ہند کے جبر کیا جاتا تھا ہر گز واپس آگئے" اور حالانکہ مولانا سید نذیر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا زیادہ تر مشغلہ درس حدیث کا تھا۔ سیاسیات میں ان کو چنداں دلچسپی نہ تھی، مگر ہماری سرکار (انگریزی) کا تو یہ حال ہے کہ غصہ آتا ہی کمزوروں پر ہے۔ حالانکہ حضرت شیخ الکل مولانا شیخ السید محمد نذیر حسین نے بعض انگریز بچوں اور عورتوں کی ہنگامہ شہداء میں مناسب اعانت بھی فرمائی تھی۔ کیونکہ ایسے معرکوں میں جہان مکمل ہو عورتوں اور بچوں کو نقصان پہنچانے سے شرعاً منع فرمایا گیا ہے۔

حضرت شیخ الکل کے تلامذہ

حضرت شیخ مولانا سید محمد نذیر حسین (دعوت شاہ محمد اسحاق) کی ہجرت حجاز کے بعد ان کی علمی جانشینی کے سبب "میاں صاحب" کے لقب سے مشہور تھے، کی سیاسیات سے کنارہ کشی اور مشاغلِ درس کے باوجود میاں صاحب کے تلامذہ سے ایک جماعت استخلاص وطن اور جہاد الہیہ کے قیام اور استحکام کے لیے بدستور سرگرم عمل رہی جن میں حضرت شیخنا الاکرم مولانا حافظ عبد اللہ صاحب غازی پوری حضرت شاہ عین الحق صاحب دہلی سواہم رحمہم اللہ اجمعین خاص طور پر قابل

ذکر میں جن کا تمام عمر یہی مشغلہ رہا۔ اپنے ذاتی اموال نیز ارباب کے بھی زکوٰۃ و صدقات و عیروہ سے مجاہدین ستخانہ (چمرکنڈ و اسس) کی اعانت فرماتے رہے۔ یہی وہ جرم عشق تھا جس کی بادشاہی میں مولانا محمد بشیر عرف عبدالرحیم بن مصنف سلسلہ کتب اسلام مولانا رحیم بخش رائف مسجد چنیا نوالی لاہور ہزاروں روپیہ کی تجارت پر لات مار کر برسوں سوات بنیر کی پہاڑیوں میں سرگرداں رہ کر وہیں ہمیشہ کی غیند ہو گئے۔

یہی حال مولانا فضل الہی وزیر آبادی کا ہے جن کے سیاہ بال یاغستان کی برت میں سفید ہو گئے اور مضبوط صحت کا ایک نوجوان آج قعرش جسم اور گری ہوئی صحت کے باوجود اسی یلئے مراد کے وصل کی انتظار میں چمرکنڈ کی سرہنگ پہاڑیوں میں اپنی موت کے دن کاٹ رہا ہے۔

جرم عشق تو ام سے کشد غوغا نیست
تو نیز بر سر بام آکد خوش تا شایست

ان بزرگانِ ملت میں بعض وہ لوگ تھے جنہوں نے اس فریضہ کو اس وقت ادا فرمایا جب کہ بہت سے علمائے ہند "جن کے" شاندار ماضی "پر آج بعض لوگوں کو ناز ہے ابھی یا تو مستقبل کی آغوش میں جو خواب تھے اور یاد اس اور مساجد کی چٹائیوں کی زینت بن رہے تھے شاید ماضی "کے مصنف کی تنگ نظری اگر انہیں علماء میں جگہ نہیں دے سکی نہ سہی مگر جدید عالم کا زیب عنوان ان کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ واقعات کے نادر اشکات قلم نے جس مقام رفیع پر ان کا نام کندہ کیا ہے، کسی متعصب اور تنگ نظر ماسد کی کم نگاہی اسے کبھی شاہیں سکتی ہے۔

ثبت است بربریدہ عالم دوام

عرض حال | آج جب کہ "کالا پانی" کا ایریڈیشن آپ کی خدمت میں پیش ہو رہا ہے اور یہ چند سطور بطور مقدمہ لکھی جا رہی ہیں، حالت یہ ہے کہ "شاندار"

ماضی "کے بعد" تاریک مستقبل "کے لیے زمین تیار ہو رہی ہیں اور علمائے حال صرف "فاتحہ خلف الامم" "کشف الستور عن مسئلۃ الوتر" اور "نبیل الفرقان" ایسی تصانیف میں مشغول ہو کر اپنے علم کی اور لے بہ تینوں کتابیں حضرت مولانا سید محمد اند شاہ مرحوم کی تالیف کردہ ہیں جن میں مثنوی الامجدیہ میں مذکور ان تین مسائل میں مثنوی مسلک کی پروردگاریت کی گئی ہے۔ (ع ۱۰ ج)

لے رہے ہیں اور فضل الخطاب کے لیے صرف یہی چند مسائل رہ گئے ہیں پر امت مدینہ شاندار تاریک مستقبل کا انحصار بھابھا رہا ہے۔ ہمارے مدارس کے عباد و بوند سے انہیں یا دہلی سے مثنوی ہوں الامجدیہ ان کی نگاہ میں سب سے بڑا اہم و جدل و مناظرہ کی دہلیاں ہیں جن میں ابو حنیفہ اور شافعی مالک اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے فردی اجتماعات پر طبع آزمائی کی جا رہی ہے اور ان خلد بنگان بزرگانِ ملت کی فتح و شکست کا بائزہ لینے کی کوشش کی جا رہی ہے غالباً یہ "بہاد" اس لیے فرض قرار دیا گیا ہے کہ انگریز بہادر کی شریعت "اسے جرم قرار نہیں دیتی ورنہ اس سے بھی کوئی زیادہ شیعہ مشغلہ تلاش کرنا پڑتا۔

حانمہ | کتاب آپ کے سامنے ہے اور اپنے بزرگوں کے کارنامے ان کے مقاصد کی تفسیر کر رہے ہیں اس راہ کے مصائب، حکومت کی گرفت، اتلان مال، اتلان جان فرض منزل عشق کے سارے آثار آپ کے سامنے ہیں۔ آپ ہیں اور اپنے مستقبل کی تعمیر آپ کا فرض، حکومت الہیہ کی تشکیل آپ کا ذمہ، ماضی کو دیکھیے اور مستقبل کو بنائیے۔ جو راہ آپ کی سرہنگ پر منتج ہو سکے اس کی طرف قدم اٹھائیے۔ خدا تعالیٰ کی رحمت ان نیک بندوں کا ساتھ دیتی ہے، جو اس کے قانون کا احترام کریں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ جَاہَدُوا فِیْہِ النَّہْذِیْنِہُمْ سَبِلْنَا۔

آج کی مشکلات | اس وقت کی مشکلات کی نوعیت گو اس وقت کی مشکلات مختلف ہے لیکن عزم و ارادہ کی کچھنگی تمام مشکلات کا صحیح حل ہے اپنی سرہنگی کے لیے کوشش انسانی فطرت کا نسطیہ والا فرض، اس کی مشکلات سے گھبرانا اپنی فطرت عذاری کے مترادف ہے۔ جماعت اہل حدیث کے نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ توحید و سنت کی اشاعت اور اسلام کی سرہنگی کے لیے بڑھیں۔ انہا لاحدی الکبر من شاء منکم ان یتقدم اویت آخر۔

محمد اسماعیل کان اللہ

خلیب مسجد اہل حدیث۔ گوجرانوالہ

بتاریخ ۲۹/۱۱

سُخنا نے گفتنی

بارہویں صدی ہجری کے آغاز میں برصغیر پاک و ہند کے اُفتی پر بادل چھائے ہوئے تھے، سیاہ بادل، شرک و بدعت کے بادل، جہالت و بربریت کے بادل — وہ مسلمان، جن کے قدمِ مہینت لزوم سے یہاں صدیوں قال اللہ و قال الرسول کے دلاویز نغمے روح کو سرور بخشتے رہے، آج خود اللہ اور رسول سے دور ہو بیٹھے تھے، کتاب و سنت کو کسفرِ فراموشی کر بیٹھے تھے — وہ مسلمان، مدتِ مدید اور عرصہٴ بعید تک جن کی عظمت و شوکت کے ہرچم یہاں لہراتے رہے، آج در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے، ان کی سلطنت کا چراغ، چراغِ سحر کی طرح ٹٹھا رہا تھا، ان کی جمعیت کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ الغرض مذہبی، علمی، تمدنی اور سیاسی ہر اعتبار سے مسلمان قوم بے انتہا زوال اور انحطاط کا شکار ہو چکی تھی۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی حالت پر ایک بار پھر رحم فرمایا اور برصغیر پاک و ہند کے اُفتی پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی شخصیت نمودار ہوئی جنہوں نے آریحیوں اور گمراہیوں کے اس ظلمتِ کدہ میں حق کے چراغِ روشن کیے، جنہوں نے یہاں کے مسلمانوں کی زندگی، عقائد اور اخلاق میں ایک حد تک انقلاب برپا کر دیا لیکن دنیا ابھی کسی دوسرے ہی مردِ میدان کی منتظر تھی۔ یہ مردِ میدان حضرت امام محمد اسماعیل شہیدؒ تھے، جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حقیقی پوتے تھے اور ان کے خواب کی تعبیر بھی۔ امام محمد اسماعیل شہیدؒ نے اپنے محترم دادا کے مشن کی تکمیل کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ اصلاحِ اعمال و عقائد کے لیے برسرِ بازار وہ کام کیے جن کے کرنے کی بڑے بڑوں کو بفرجروں کے اندر

نجی کتاب نہ تھی۔ امام السند مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ آج اگر شاہ ولی اللہؒ بھی زندہ ہوتے تو وہ امام محمد اسماعیل شہیدؒ ہی کے جھنڈے تلے کام کرتے۔

امام محمد اسماعیل شہیدؒ نے ایک طرف دین و عقائد اور اخلاق کی اصلاح کے لیے بیچنا کام کیا، جہاں تہاں تشریف لے گئے، آپ کے علم و فضل کی بدولت دبستان کھلتے گئے جن سے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی صدائیں گونج اٹھیں اور تقویۃ الایمان، ”منصب امامت“ اور ”حقیقات“ وغیرہ کے معطر جھونکوں سے مشامِ جان جھوم جھوم اٹھے۔ دوسری طرف آپ سکھوں، مرہٹوں اور انگریزوں کے آلام و مصائب سے نجات دلانے اور مسلمانوں کو ان کی عظمتِ رفتہ واپس لے کر دینے کے لیے سرپرکفن باندھ کر میدانِ کارزار میں کود گئے حتیٰ کہ اپنے مقدس خون سے بالاکوٹ کی وادیوں کو لالہ زار بناتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرما گئے۔

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر۔ زوری سجدہ می خواہی زخا کی بسٹیں ازاں خواہی چنناں خود پانچ داری کہ بایں بے نیازی ۱ شہادتِ بروجد خود خونِ دوستاں خواہی حضرت امام محمد اسماعیل شہیدؒ، ان کے بے مثل پیرومرشد حضرت سید احمدؒ اور جانا باز رفقا کی شہادت کے بعد، بقیۃ السیف مجاہدین نے دعوتِ اصلاح و جہاد کا علم سونچوں نہ ہونے دیا بلکہ اس بے سرو سامانی کی کیفیت میں جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، اللہ کے نام سے آئے بلند سے بلند تر رکھنے کی کوشش کی اور عزیمت و استقامت کی وہ آگ لگا دی جس کے شعلوں نے پچیس سال تک سکھوں اور ایک سو سال تک انگریزوں جیسی زبردست جابر قوم کو مسلسل آتشِ زیرِ پا رکھا اور لطفِ یاسم کی بات یہ ہے کہ یارِ لوگوں کو ابھی تک اصرار ہے کہ ان مجاہدین کا جہاد انگریزوں کے نہیں بلکہ صرف سکھوں کے خلاف تھا۔

امام محمد اسماعیل شہیدؒ، ان کے جانا باز رفقا اور ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے تحریک کو زندہ رکھنے والے مجاہدین کی یہ داستان ہماری ملی غیرت اور اسلامی حمیت کی سب

سے پُراثر داستان ہے۔ ان اللہ والوں نے اللہ کی خاطر آرام و مصائب کو برداشت کیا، آتش باریوں اور شمشیر زنیوں کی بیگناہ آرائیوں میں جانیں دے دیں، خاندان، گھر بار اور جائیدادوں کی قربانیاں دیں، جیل کی کال کو ٹھریلوں اور جزائر اندیمان یعنی کالا پانی کی بھیاں اور خوفناک وحشت ناکیوں میں دن بسر کیے لیکن حسین عزیمت پر بھی شکن نہ آنے دی اور پائے استقامت میں کبھی لرزش پیدا نہ ہونے دی۔ زندگی کے ہر آرام اور برہنہ کو کھوارت سے ٹھکراتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، تنہا تھی تو ایک اور صرٹ ایک ہی تھی کہ اپنی شہ رگ کے گرم گرم خون شجر اسلام کو سیراب کریں۔

لڑتی ہے ان سے نگاہ حیات
یہی لوگ ہیں حاصل کائنات!

انہی "حاصل کائنات" قسم کے لوگوں میں سے ایک محمد جعفر تھانویؒ بھی تھے۔ آپ تھانوی صلیع انبالہ کے باشندہ تھے۔ والد صاحب کا نام میاں جیون تھا۔ ۱۸۳۲ء میں ولادت باسعادت ہوئی۔ عمر شریف کی ابھی چند بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ والد کا سایہ شفقت سر سے اٹھ گیا۔ ۱۸۵۶ء تک قریب مجاہدین میں باقاعدہ طور پر داخل ہو چکے تھے۔ آپ تحریک کے سینئر ممبر اور بہت بڑے رازدار تھے۔ سرحد کو روپیہ اور مجاہدین کی فراہمی آپ کے ذمہ تھی۔ آپ علماءِ قادریہ کے محقق علیہ اور ان کے راز ہائے سربست کے امین و محافظ تھے۔ جنگِ اہلبیلہ کے بعد جب ۱۸۶۱ء میں انبالہ کا مشہور مقدمہ ظہور پذیر ہوا تو حکومت نے اس یقین پر کہ سرحد پر مجاہدین کی مالی و جانی ہر طرح کی آپ امداد کرتے ہیں، آپ کی خلیہ تلاشی کا پروگرام بنایا، آپ نے راہِ فرار اختیار کی تو حکومت نے گرفتاری کے لیے دس ہزار روپے کا اشتہار جاری کر دیا۔ آخر کار علی گڑھ میں پکڑے گئے تو پھر انبالہ لائے گئے، مقدمہ چلایا گیا جس کا ۲۸ مئی ۱۸۶۲ء کو فیصلہ سنایا گیا کہ تمام جائیداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط اور پچانسی کی سزا۔ آپ کو ہر طرح کا لالچ بھی دیا گیا اور طرح طرح کے آرام و مصائب کا شوق مشق بھی بنایا گیا مگر کسی طرح

جی آپ کے پائے استقلال میں ذرہ بھر جنبش پیدا نہ ہوئی، آپ نے اس مقدمہ میں نہایت مزیدار استقامت کا مظاہرہ فرمایا۔ مقدمہ کا فیصلہ سناتے ہوئے جج آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:-

"تم بہت عقلمند، ذی علم، قانون دان اور اپنے شہر کے فہرہ دار اور رئیس ہو۔ تم نے اپنی ساری عقلمندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا، تمہارے ذمہ سے آدمی اور روپیہ سرکار کے دشمنوں کو جاتا تھا۔ تم نے سولے انکار بحث کے کچھ جیتا بھی خیر خواہی سرکار کا دم نہیں بھرا اور باوجود فحاشی کے اس کے ثابت کرانے میں کچھ کوشش نہ کی۔ اس واسطے تم کو پچانسی دی جائے گی اور آخر میں یہ کہہ بھی فرمایا کہ میں تم کو پچانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔"

آپ نے فیصلہ سن کر قطعاً کسی قسم کی پریشانی یا گھبرلاہٹ کا مظاہرہ نہ فرمایا آخری الفاظ کے جواب میں جج کو نہایت پامردی سے جواب دیا:-

"جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے، آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ رب العزت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کر دے۔"

آپ کے یہ الفاظ ایک مظلوم کی زبان سے نکلے ہوئے تھے جو آسمانوں کو چیرتے ہوئے سیدھے عرشِ بریں تک پہنچے۔ قدرت نے انہیں سچا ثابت کر دکھایا اور چند روز بعد وہ جج اپنی موت آپ مر گیا۔

ادھر پچانسی کی سزائیں کر آپ پر سترت کی کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ انگریز یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ پچانسی کی سزا کا حکم سننے کے بعد بھی کوئی انسان اس قدر ششاش بھاش رہ سکتا ہے۔ چنانچہ آپ کو دیکھنے کے لیے جیل میں انگریزوں اور سیوں کا اتنا تابندہ کیا۔ کسی انگریز نے آپ سے پوچھا کہ پچانسی کی سزا سننے کے بعد یہ سترت

کیسی؟ آپ نے ایمان پر درجواب دیا! ”راہِ خدا میں جان دینا ہمارے نزدیک بڑی سعادت ہے اور ہمارے دین میں اسے شہادت کہا جاتا ہے!“ اللہ اللہ یہ کیا انسان تھے، ہر جتنی ہوتی آندھی تھے کہ بڑھتے ہوئے طوفان تھے۔

ہلاکت نہ تھی موت اُن کی نظر میں

یہ کیا ٹپ تھی! کیا جذبہ تھا! کیا ایمان تھا!!!

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی!

آخر کار انگریزوں نے آپ کی پچاسی کی سز کو جس دوام بعبر دور یا نئے شور میں تبدیل کر دیا تاکہ شمعِ حریت کے اس پروانے کو آلام و مصائب کی آگ میں زیادہ سے زیادہ بجلا یا جاسکے۔ ستمبر ۱۸۶۴ء سے فروری ۱۸۶۵ء تک آپ انبالہ جیل میں ہی پابندِ زنجیر و سلاسل رہے اور پھر لاہور پہنچا دیے گئے۔ ۲۲ فروری ۱۸۶۵ء کو لاہور جیل سے روانہ ہوئے اور ملتان، سکھر، ٹھٹھہ اور کوٹری ہوتے ہوئے کراچی پہنچے۔ ایک ہفتہ کراچی جیل میں رہنے کے بعد باد بانی جہاز کے ذریعہ بمبئی روانہ ہو گئے، وہاں ایک ماہ تھا کہ جیل میں مقیم رہتے ۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو وہاں سے روانہ ہوئے اور آخر کار ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو آپ انڈیا مان پینچ گئے۔ سترہ سال دس ماہ بسر کرنے کے بعد انڈیا مان سے ایک بیوی، آٹھ بچے اور آٹھ ہزار روپے نقد لے کر ۹ نومبر ۱۸۸۳ء کو ہندوستان روانہ ہوئے اور ۲۰ نومبر ۱۸۸۳ء کو ۹ بجے شب انبالہ چھاؤنی کے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ اس طرح تقریباً ۱۸ برس کے بعد اس مردِ مجاہد کو وطن کی مقدس سرزمین دیکھنا نصیب ہوئی۔

”کالا پانی“ اسی درتیم بعل شبِ چراغ، یا قوتِ احرارِ مدحِ آگاہ محمد بن محمد بن علی کی خود نوشت سرگزشت ہے، جس میں آپ نے جزائرِ اندامان سے واپسی پر اجاباب کے اصرار پر اپنی گرفتاری، مقدمے، قید، سفرِ اندامان، انڈیا مان کی زندگی کے حالات نہایت

دلنشین انداز میں تحریر فرمائے۔ یہ کتاب کئی مرتبہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی۔ پہلا ایڈیشن خود مولانا تھانیسری نے اس داسانِ آلام و مصائب کے ختم ہونے کے بعد تواریخِ عجیب المعروف بہ تاریخِ عجیب کے نام سے شائع کیا تھا، جو کہ بالکل چھوٹے سائز پر تھا اور اس میں کوئی باب یا ذیلی شرحی نہ تھی۔ اس ایڈیشن کا ایک نسخہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کی لائبریری میں موجود ہے۔

اس کے بعد صوفی ٹپنی منڈی بہار الدین نے ابواب اور ذیلی سرخیاں قائم کر کے اس کے متعدد ایڈیشن شائع کیے۔ ۱۹۳۵ء میں مکتبہ سلفیہ ملتان نے اور ۱۹۳۳ء میں اقبال اکیڈمی لاہور نے اس کتاب کی اشاعت کی سعادت حاصل کی۔ اسی طرح نفیس اکیڈمی حیدرآباد دکن نے ”ایک مجاہد کی ڈائری“ کے نام سے عمدہ کتابت و طباعت سے شائع کیا، جب کہ نفیس اکیڈمی کراچی نے مکتوباتِ سید احمد شہید (جو کہ سوانح احمدی کا ایک حصہ ہے) کے آخر میں اسے بھی ساتھ ہی لگا کر شائع کیا ہے۔ فاروقی کتب خانہ ملتان نے بھی اس کتاب کے بعض ایڈیشن ”کالا پانی“ اور بعض ”اسلامی تحریک کا مجاہد“ کے نام سے شائع کیے ہیں۔ موخر الذکر نام سے موسوم ایڈیشن کے آغاز میں تقریباً اشاعت کے نام سے حافظ عبدالحق سلیم کا مختصر سہ ماہیہ ہے جبکہ اسلامی تحریک کا مجاہد کے نام سے شاہین فاروقی کا قدرِ مفصل اور زوردار پیشِ نظر ہے۔

اس کتاب کا ایک نہایت قابلِ ذکر ایڈیشن سلمان اکیڈمی کراچی نے تواریخِ عجیب المعروف بہ کالا پانی کے نام سے ستمبر ۱۹۶۲ء میں شائع کیا، جسے ہمارے فاضل دوست بناب محمد ایوب صاحب قادری نے مرتب کیا ہے۔ اس ایڈیشن کا تعارف بناب کٹر محمد حسین صاحب، انس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی اور رئیسِ لفظ بناب نیل جالبی کے قلم سے ہے، جبکہ خود قادری صاحب نے ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے۔ متن کی تشریح و توضیح کے لیے جابجا مافیہ جواشی لکھے ہیں۔ کتاب میں مذکور شخصیتوں کے احوال و کوائف تذکرہ جیل

کے نام سے مرتب کیے ہیں اور آخر میں جدید رجحان MODERN TREND کے مطابق کتابیات و اشارات کی فہرست بھی دی ہے۔

جناب محمد ایوب صاحب قادری اپنی اس علمی خدمت کے باعث بہاں بہاں سے شکریہ کے بطور خاص مستحق ہیں۔ وہاں ہیں ان سے شکوہ بھی ہے کہ وہ اپنے دقیق اور مفصل مقدمہ میں عدل و انصاف کا مظاہرہ نہ فرما سکے جس کی ہمیں ان کے ظلم و فتنل سے توقع تھی۔ چنانچہ سید احمد شہید اور حضرت امام محمد اسماعیل شہید کی تحریک جہاد، مجاہدین کی قربانیوں، انگریزوں کی دشمنیوں اور اپنوں کی غداریوں کا اختصار کے ساتھ جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”غیروں اور اپنوں کے اس رویے سے بدنام ڈہانی“ گھبرا گئے اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ جہاد کی تحریک اندرون ہند پاکستان قطعی طور سے ختم ہو گئی۔ اپنے لئے ڈہانی“ کی بجائے اہل حدیث“ کا نام مروج و مشہر کیا۔ انہوں نے باقاعدہ وفاداری حکومت برطانیہ کا اعلان کیا۔ مولوی محمد حسین بنادی (ف ۱۳۳۸ھ) نے سرکاری تحریرات میں ”ڈہانی“ کے بجائے ”اہل حدیث“ لکھ جانے کے باقاعدہ احکام جاری کر دیئے۔ غرض انگریز نے اپنے بے پناہ مظالم اور شاطرانہ سیاست سے اس اسلامی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ تحریک کا رخ بدل گیا اور اب وہ چند فروعی مسائل میں الجھ کر رہ گئی۔

قادری صاحب کا یہ سارا بیان تاریخی غلطیوں اور غلط فہمیوں کا شاہکار ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ گروہی تعصب کا شدید شکار ہیں۔ سوچی سمجھی سکیم یا کسی مخفی جذبے کی تسکین کی خاطر آپ آئے دن اس قسم کی تحقیق“ پیش فرماتے رہتے ہیں، چنانچہ یہ تحقیق“ جو آپ نے ”کالا پانی“ کے اس مقدمہ میں پیش فرمائی ہے، اسے سن وں اپنے اس مقدمہ

میں بھی دوہرا چکے ہیں جو آپ نے حیات سید احمد شہید (نفیس اکیڈمی کراچی) پر لکھا ہے بلکہ وکاست ان خیالات کا اظہار اپنی تازہ کتاب ”جنگ آزادی“ میں بھی کیا ہے۔ آپ نے اپنے خیالات کا اظہار غالباً سب سے زیادہ کھل کر سید احمد خاں اور وہابی تحریک“ بھی اس مضمون میں کیا تھا جو جولائی ۱۹۷۹ء کے ”البلاغ“ کراچی اور چٹان“ لاہور میں شائع ہوا تھا۔ اسی وقت ہمارے فاضل دوست جناب مولانا عبدالحق صاحب قدس لاہور نے تیرہ قسطوں پر مشتمل اپنے ایک مفصل، مکمل مستند اور مدلل مضمون میں قادری صاحب کی اس تحقیق کا پوسٹ مارٹم کیا تھا، جو کہ بغیر روزہ الاعتصام“ لاہور میں شائع ہوا تھا۔ خیال تھا کہ ان ٹھوس تاریخی دلائل و براہین کو دیکھ کر قادری صاحب اپنے خیالات پر نظر ثانی فرمائیں گے۔ افسوس کہ قادری صاحب کی تازہ کتاب ”جنگ آزادی“ دیکھ کر ہماری یہ خوش فہمی غلط ثابت ہوئی اور انہوں نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ ”کل ایہ اوحدیث بخلاف ما علیہ اصحابنا فهو ما ڈل او منسوخ“

قادری صاحب کی ایک بار پھر اس تحقیق کو دیکھتے ہوئے خیال ہوا کہ ہم بھی ”کالا پانی“ کے اس مقدمہ میں اس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے جائیں۔ یہاں سے من هلك عن بينة و رنجی من حی عن بینة۔

قادری صاحب کے مقدمہ سے پیش کیے ہوئے مذکورہ اقتباس سے بھی پہلے ان کے یہ ارشادات پڑھئے۔

”حقیقت یہ ہے کہ انگریز نے تحریک جہاد کو بری طرح کچلا۔ مجاہدین اور مصلحین کو ڈہانی کے نام سے موسوم کر کے بدنام کیا گیا۔ تمام ملک میں ایہوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا۔ مرکزی حکومت نے صوبائی حکومتوں سے ان کے حالات اور سرگرمیوں کی کیفیت طلب کی۔ ایک ٹکڑا سرانجام سانی اسی قسم

کے لیے وجود میں آیا۔ حکومت انگریزی نے باغی اور وہابی مترادف الفاظ قرار دیئے۔ عامۃ المسلمین میں ان کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کیا اور ایک عام معاشرتی انقطاع شروع کیا گیا۔

تحریک جہاد اور مجاہدین کی اس شکست و ریخت کے سلسلہ میں گزارش یہ ہے کہ انگریزوں کے طرز عمل کا شکوہ بجا ہے، آفرودہ تو دشمن تھے، ان سے ہر بات کی توقع تھی۔ مجاہدین نے جب انہیں تقریباً سو سال تک آتش زیر پا رکھا تو انہوں نے بھی انتقام کے لیے ہر ممکن عز اختیار کیا۔ افسوس تو اپنے میرسادقوں اور میرجعفروں پر ہے۔ انگریزوں سے شاید ہمیں اتنا نقصان نہ پہنچا ہو جتنا کہ اپنوں کی غداہیوں اور سازشوں سے۔ قادری صاحب کو بتانا چاہیے تھا کہ یہ سراخ رسانی کے فرائض انجام دینے والے کون تھے؟ نفرت کا جذبہ کن لوگوں نے پیدا کیا؟ اور یہ انقطاع کرنے والے کون تھے؟

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سیدین شہیدین کی جماعت میں اہل حدیث اور احناف دونوں گروہ موجود تھے اور ان کی برکت سے ہندوستان محبت میں مرید پریناں لیکن حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید کی شہادت کے بعد جب جماعت کی زمام الہمدیث بزرگوں کے ہاتھ آئی تو علماء احناف آتش حسد سے جل اٹھے، چنانچہ انہوں نے تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی، تعاون سے انکار کر دیا اور دن بدن دُور سے دور تر ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ حنفی مکتب فکر کے مشہور بزرگ مولانا کرامت علی جوہری، جو کہ سید صاحب کے خلفاء میں سے تھے، ان کے متعلق خود قادری صاحب رقمطراز ہیں کہ:-

”آپ نے انگریزی حکومت کی موافقت میں جہاد کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔“

۱۔ مقدمہ ”کالا پانی“ از محمد ایوب قادری ص ۲۸-۲۹

۲۔ تذکرہ علماء ہند ص ۳۹۶

اسی طرح مولانا مسعود عالم ندوی نے بھی ان کے متعلق لکھا ہے کہ:-
مجاہدین اور اتباع سید احمد شہید کے سب سے بڑے واقف کار مسٹر جیمس اوکنلی نے شہادت دی ہے کہ مولوی کرامت علی صاحب بھٹانی حکومت کے مؤید اور وہابیوں کے پکے مخالف تھے۔ یہ تصدیق نامہ راج محل (بہار) میں ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۷ء کو دیا گیا، جسے خود ان کے پوتوں نے فریہ ۱۹۱۴ء میں درج کرایا تھا (وہ خوبصورت اور نظر فریب پمفلٹ راقم کی نظر سے گزر چکا ہے) اس میں ان کے صاحبزادے اور مشہور ادیب مولوی عبدالاول صاحب جوہپوری اور حافظ احمد صاحب کی وفاداری کی بھی تصدیق ہے۔ اس کے علاوہ راقم یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ عقائد و اعمال میں وہ سید صاحب کے اصحاب خاص کی روش سے بالکل الگ تھے۔

نہ صرف یہ کہ علماء احناف نے تحریک جہاد سے بیٹھ گئی اختیار کر کے اس کی مخالفت شروع کر دی بلکہ انگریزوں کے ساتھ الفت و محبت کے رشتے قائم کیے، سرکاری ملازمتیں اختیار کیں اور قتل و غارتگری کا ثبوت دیا۔ دیوبندی تحریک کے امیر اول مولانا مملوک علی ساری زندگی سرکاری ملازمت سے وابستہ رہے اور قتل و غارتگری اور کامل انہماک اور خلوص کے ساتھ انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کو کامیابی سے بکنار کرنے کے لیے دن رات مسلسل محنت کرتے رہے، چنانچہ مولانا مناظر حسن گیلانی رقمطراز ہیں:-

”نانوتہ میں مظاہر العلوم کے مدرس اول مولانا محمد مظہر ناتوتوی، اسحاق العلوم کے مترجم مولانا محمد احسن ناتوتوی، دیوبند میں مولانا ذوالفقار علی (حضرت شیخ الہند کے والد ماجد) مولانا فضل الرحمن (مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد ماجد) اور اس قسم کے بیسیوں بزرگ جو ہم پاتے ہیں، علم و فضل کے ساتھ مشہور ہیں، ان

۱۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۴۰-حاشیہ

میں سے بعض حضرات انگریزی حکومت کی طرف سے محکمہ تعلیمات کے انسپکٹر بھی تھے مثلاً شیخ الہند کے والد ماجد اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد ماجد دونوں حضرات کا جو حال ہے، جہاں تک میرا خیال ہے اس علاقہ کی اس جدید علمی روشنی میں بہت زیادہ ذہل مولانا مملوک علی کے وجود باوجود کو ہے۔ دلی پہنچنے اور وہاں کی تعلیمی سہولتوں سے مستفید ہونے کا موقع ان بزرگوں کو بظاہر مولانا مملوک علی کی وجہ سے میسر آیا۔

مولانا مملوک علی کے اکثر تلامذہ کی کیفیت بھی بالکل یہی تھی، مولوی سمیع اللہ آپ کے مشہور شاگرد ہیں، انگریزوں کو ان پر بڑا اعتماد تھا، یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے انہیں ایک خاص مشن پر ضرر بھی بھیجا، چنانچہ جناب قادری صاحب نے خود بھی ان کے متعلق لکھا ہے کہ :-

”۱۶ ستمبر ۱۸۸۴ء کو مولوی سمیع اللہ مصر میں انگریزوں کے استعمار کو مضبوط کرنے کی غرض سے پولیشکل مشن پر مصر گئے اور وہاں انہوں نے جمال الدین افغانی کی تحریک کو نقصان پہنچایا۔ ان خدمات کے صلہ میں ان کو سی۔ ایم۔ جی۔ کا خطاب ملا۔“

اسی طرح مولانا محمد حسن نانوتوی، دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد ماجد مولانا فضل الرحمن، مولانا محمود الحسن کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی اور دیگر بے شمار اکابر علماء احناف کی اکثریت کسی نہ کسی طرح سرکار انگریزی سے منسلک ہو گئی اور رزم شبیری کو اکرنے کے لیے اکیلے اہل حدیث میدان میں رہ گئے۔ تبعب ہے کہ قادری صاحب انگریزوں کی ستم رانیوں کا تو ذکر کرتے ہیں اور ان برادران یوسف کی نوازشوں کو قبول جاتے ہیں۔ انگریزوں کی بربریت سے شاید اس قدر نقصان نہ پہنچا ہو جتنا کہ

من از بیگانگان هرگز نہ نام
کہ ہر چہ کلام با من آشنا کرد

”اگر ایک طرف ولیم ولسن ہنٹرنے ”آر انڈین مسلمانس“ لکھ کر ان کے خلاف حکومت کو مواد ہتیا کیا تو دوسری طرف مولانا فضل رسول بدایونی نے ۱۲۸۹ھ اور ان کے تلامذہ نے غریب ”وہابیوں“ کے خلاف تصنیفات کا ایک انبار لگا دیا۔“

فضل رسول بدایونی اور ان کے ہمنواؤں کو چھوڑ کر ان کا اول و آخر مقصد ہی سپٹ کی پوجا اور انگریز بہادر کی خوشنودی تھی۔ فضل رسول بدایونی نے اگر ان پاکباز مجاہدین اور ان کے افکار و نظریات کی تردید میں اپنا پورا زور قلم صرف کر کے ”سیف الجبار“ ”احقاق الحق و ابطال الباطل“ ”ابحارق الحمدیر لرحم الشیاطین النجذیہ“ ”تصمیم المسائل“ اور مجموعہ رسائل و فوائد وغیرہ کتب لکھیں تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں کیونکہ وہ انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے اور انہیں حق نہ مل سکتا تھا، انہیں اپنے آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنا ہی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کی تو اکثر وہ بیشتر کتب بھی سرکاری ملازمین کی اعانت ہی سے شائع ہوئی ہیں فضل رسول بدایونی اور ان کے ہم نواؤں کی اس خدمت اسلام کی تفصیل کے لیے دیکھئے ہماری کتاب ”مذکرہ شہید“ سروسٹ سوال یہ ہے کہ کیا فضل رسول بدایونی اور اس کے تلامذہ کی نسبت ارباب دیوبند کا ذکر درمختل تھا؟ کیا انہوں نے اہل حدیث پر مسجدوں کے دروازے بند نہ کیے؟ معاشرتی انقطاع نہ کیا؟ ان کے خلاف فتوے مرتب نہ کیے؟ کتابیں نہ لکھیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس مقدس مہم کے آغاز کا سربراہی مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کے جلیل مولوی محمد لدھیانوی کے سر ہے جنہوں نے ”انتظام المساجد باخراج اہل الفتن والمفاسد“

نامی "کتاب مقدس" میں ان "غریب و ہمایوں" کو مرتہ قرار دیا اور حکام بالا سے ان کے قتل کا مطالبہ کیا اور اسی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ اسلاف دیوبند نے مولوی محمد لدھیانوی کو مزید ٹھک پہنچانے کے لیے ایک اور فتویٰ کا اہتمام کیا، جس کا نام تھا "جامع الشواہد فی اخراج الوہابین عن المساجد" اور اس پر لدھیانہ، دیوبند، گنگوہ، رامپور، پانی پت اور دیگر بہت سے شہروں کے مفتیان احناف کی مہریں اور دستخط ثبت تھے۔ کالا پانی کے مقدمہ میں تو قادری صاحب نے صرف بدایونی صاحب اور ان کے تلامذہ کا ہی ذکر کیا لیکن مقامِ محرمت ہے کہ وہ گھر کے مجیدوں سے بھی آگاہ ہو گئے ہیں اور اب انہوں نے مولوی محمد لدھیانوی مولوی دمی احمد سورتی ثم پٹیلی پھیمی اور مولوی نبی بخش حلوانی کی ان خدماتِ جلیلہ کی طرف بھی دینی زبان سے اشارہ کر دیا ہے۔

اسی زمانہ میں سراج اہل حدیث اور سرخیل مجاہدین حضرت میاں سید تیز حسین محدث دیوبند کے ساتھ ارباب دیوبند خصوصاً حاجی امداد اللہ صاحب مولانا رحمت اللہ کیرانوی مولوی خیر الدین اور مولوی عبدالعادر بدایونی نے سرزمینِ حجاز میں "جو حسن سلوک" کا مظاہر فرمایا وہ تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد الحسن دیوبندی، مولوی محمد حسن منہجلی، مولانا محمد قاسم نانوتوی حتیٰ کہ مولانا عبدالحی صاحب مگھنوی جیسے علماء دین نے اہل حدیث کے خلاف جس لب و لہجہ میں گوبر افشانی فرمائی، وہ تاریخ کے اوراق میں ثبت ہے۔ مولوی محمد حسن منہجلی نے تو اس قدر کوثرِ تسنیم میں دھلی ہوئی زبان استعمال فرمائی کہ بدایون والوں کے حاشیہ خیال پر بھی نہ کھٹکی ہوگی۔ ملاحظہ فرمائیے "نظم الفرائد حاشیہ شرح معانی"۔

اس سارے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے قادری صاحب کے ان ارشادات کو ایک بار پھر پڑھیے، جو پہلے اقتباس میں مذکور ہیں اور پھر خود انصاف سے فرمائیے کہ حکومتِ برطانیہ کے وفادار اہل حدیث مجاہدین تھے یا ارباب دیوبند، اگر عدل و انصاف

کے دامن کو تمام کرباب کے صفحات کی ورق گردانی کی جائے تو یہ حقیقت طشت از بام ہو جائے گی کہ جب بڑے بڑے اصحاب جبہ و دستار، دیوبند اور سہارنپور کے مدرسوں کے بندگان کے اندر بھی انگریزوں کے خلاف کوئی بات منہ پر لانے کی جسارت نہ کر سکتے تھے، تو وہ صرف اہل حدیث جاننا ہی تھے جو انگریز سوبر ماؤں کو لوہے کے چنے چبوا رہے تھے۔ جناب قادری صاحب خود ہی انصاف سے فرمائیں کیا یہی وفاداری حکومتِ برطانیہ ہے؟

وہابیوں پر وفاداری حکومتِ برطانیہ کا بے بنیاد الزام عائد کرنے کے بعد جناب قادری صاحب نے حضرت مولانا محمد حسن ثالویؒ کو اپنی تحقیق کا بطورِ خاص تحفہ مشق بنایا ہے، چنانچہ آپ مذکورہ اقتباس میں قادری صاحب کا یہ ارشاد پڑھ چکے ہیں:-

"مولوی محمد حسین ثالوی (ف ۱۳۳۸ھ) نے سرکاری تحریکات میں وہابی کے بجائے لکھے جانے کے باقائدہ احکام جاری کرائے۔"

اسی طرح انہوں نے اپنے مضمون "سرسید احمد خاں اور وہابی تحریک" میں بھی اس الزام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:-

"اس سلسلہ میں مولوی محمد حسین ثالوی کی نمایاں خدمات ہیں۔ انہوں

نے ایک رسالہ اشاعت السنۃ خاص اسی مقصد کے لیے جاری کیا کہ وہابیوں

کو گورنمنٹ کے قریب تر کر سکیں۔ انہوں نے جہاد کی سودی پر نہ صرف

معنا میں لکھے بلکہ مستقل ایک رسالہ الاقتصاد فی مسائل الجہاد لکھا۔"

اور اب پھر یہی الزام انہوں نے اپنی تازہ کتاب جنگ آزادی میں ان الفاظ میں

دہرایا ہے کہ:-

مولوی محمد حسین ثالوی (ف ۱۳۳۸ھ) نے سرکاری تحریکات

میں وہابی کے بجائے اہلحدیث لکھ جانے کے باقاعدہ احکام جاری کرائے
مولوی محمد حسین بٹالوی نے سرکار برطانیہ کی وفاداری میں جہاد کی فسوخی پر ایک
مستقل رسالہ "الاقتصاد فی المسائل الجہاد" ۱۲۹۲ھ میں لکھا۔

ان مذکورہ اقتباسات سے درج ذیل اعتراضات والزامات نمایاں طور واضح ہو
رہے ہیں :-

۱۔ مولانا نے "اشاعت السنہ" خاص اس مقصد کے لیے جاری کیا کہ وہابیوں کو گورنمنٹ
کے قریب تر کر سکیں۔

۲۔ مولانا نے وہابی کے بجائے "اہلحدیث" لکھ جانے کے باقاعدہ احکام جاری
کرائے۔

۳۔ انہوں نے سرکار برطانیہ کی وفاداری میں جہاد کی فسوخی پر نہ صرف مضامین لکھے بلکہ
مستقل ایک رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" لکھا۔

اب ہم انتہائی اختصار کے ساتھ قادری صاحب کہ ان الزامات کا جائزہ لیتے ہیں۔
پہلا اعتراض "اشاعت السنہ" کے مقصد اجراء پر ہے اور یہ اتنا بے بنیاد اعتراض ہے
کہ ہم اسے افزار یا کذب محض سے تعبیر کر سکتے ہیں کیونکہ جو لوگ اشاعت السنہ کے اجراء
کے پس منظر اور ابتدائی پرچوں میں اس کے مدیر کی طرف سے بیان کردہ اعتراض و مقاصد
سے آگاہ ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس رسالہ کا مقصد تقلید اور نیچریت کی تردید تھا۔
یہاں ہم خود مولانا بٹالوی کی شہادت پیش نہیں کریں گے کہ شاید وہ قادری صاحب ایم ای
کے ہاں معتبر نہ ہوں لہذا ہم یہاں سرسید احمد خاں کی شہادت نقل کرتے ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں
"مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب لاہوری ہر ہینہ ایک رسالہ نکالتے

ہیں، جس کا نام اشاعت السنہ ہے۔ یہ رسالہ دراصل انہوں نے اپنے چھوٹے
بھائیوں کی خدمت گزاری کے لیے نکالا تھا یعنی اس زمانہ میں جن کو لوگ وہابی

کہتے ہیں۔ دو فرقوں میں منقسم ہو گئے ہیں ایک وہابی مقلد دوسرے وہابی
لاذہب یا غیب مقلد جو اپنے تئیں مدیاہل حدیث کے نام سے
موسوم ہونا پسند کرتے ہیں اور وہ لوگ جو بدعتی کہلاتے ہیں پہلے فرقہ کو
چھوٹے بھائی اور دوسرے فرقہ کو بڑے بھائی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ مولانا بٹالوی کے اشاعت السنہ جاری کرنے کا مقصد اپنے
چھوٹے بھائیوں مقلدین کو راہ راست پر لانا تھا، چنانچہ ابتداء میں یہ رسالہ
تردید تقلید اور اشاعت سنت ہی کے لیے وقف تھا لیکن بعد میں جب سرسید مرحوم اور
ان کی نیچریت کا چرچا ہوا تو مولانا نے "اشاعت السنہ" کا رخ اس طرف پھیر دیا۔ یہی وجہ ہے
کہ مولانا نے "تہذیب الاخلاق" کی تردید میں شائع ہونے والے رسالوں میں "اشاعت السنہ"
کو شمار کیا ہے۔ الغرض قادری صاحب کا یہ دعویٰ کہ اجراء کا مقصد اہل حدیث کو انگریز
کے قریب کرنا تھا، انتہائی بے بنیاد اور بے دلیل ہے اگر ان کے پاس کوئی دلیل ہو تو
پیش فرمائیں۔ ہاتوا برہانکہ ان کنتہ صادقین !

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے وہابی کے بجائے اہل حدیث لکھ جانے کے
باقاعدہ احکام جاری کرائے۔ گویا مولانا بٹالوی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اہل حدیث
کے لفظ کو ایجاد کیا۔ یہ بالکل وہی اعتراض ہے جسے نئے انداز اور نئی تحقیق سے پیش
کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو اس زمانہ میں بعض نیم غاندہ یا غیر محقق لوگ کیا کرتے ہیں
کہ فرقہ اہل حدیث کی ابتداء زیادہ سے زیادہ ایک صدی یا اس سے کچھ اوپر کی ہے۔
کسی فرقہ کی جدت یا قدامت کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے
کہ یہ فرقہ جس کی طرف منسوب ہے اس کا تعلق کس زمانہ سے ہے اس اصول کے مطابق
جب ہم اہل حدیث کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ اصول اپنی ذاتی شہادت سے بغیر کسی خارجی دلیل

کی احتیاج کے بیاں دہل اعلان کر رہا ہے کہ اہل حدیث اسی وقت سے ہیں جب سے حدیث مصطفیٰ ہے اور اہل حدیث کا اصل اسوہ یہ ہے ۔
اصل دیں آدہ کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیث مصطفیٰ بر جان مستم داشتن

بھلا اللہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارا کوئی عقیدہ، کوئی عمل اور کوئی طریق عبادت ایسا نہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سکھایا یا ارشاد فرمایا ہو یا نہ ہو یا کم از کم محدث صحابہ میں اس پر عمل نہ ہوتا ہو۔ اگر آپ تفصیل کے ساتھ اہل حدیث کی قدامت کے دلائل اور ان کے افکار و عقائد کی تفصیل جاننا چاہتے ہیں تو ہم امام العصر حضرت مولانا جافظ محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کی "تاریخ اہل حدیث" اور حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب محدث گوجرانولہ رحمۃ اللہ علیہ کی "تحریک آزادی فکر" کے بغور مطالعہ کی دعوت دیں گے۔ مختصر طور پر صرف یہ عرض کریں گے کہ برصغیر پاک و ہند کو سب سے پہلے اپنے قدوم مہینت لندوم سے نوازنے والے بزرگ تابعی حضرت ربیع بن صبیح السعدی البصریؒ ہوں یا وہ مقدس قافلہ جس نے سب سے پہلے فاطمہ جنتیت میں ساحل ہند پر درود فرمایا یہ سب اہل حدیث تھے لہذا یہ اعتراض کس قدر محکمہ خیر ہے کہ اہل حدیث کا آغاز کوئی سو اسو سال سے ہوا ہے یا بقول قادری صاحب مولانا محمد حسین ثنائویؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس نام کو اختیار کیا بلکہ انگریزوں سے اس کے باقاعدہ احکام جاری کرائے۔

جناب قادری صاحب کا مولانا ثنائویؒ پر تفسیر اعتراض یہ تھا کہ انہوں نے جہاد کی مفسوخی پر نہ صرف مضامین لکھے بلکہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" کے نام سے ایک مستقل رسالہ بھی لکھا۔ قادری صاحب کا یہ اعتراض بھی سراسر استہمام اور مافراہ ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ کتاب کا نام ہی اس الزام کی تردید کر رہا ہے اسے کاشش انہوں نے اس پر غور فرمایا ہوتا معلوم ہوتا ہے کہ قادری صاحب نے شاید یہ کتاب نہیں

دیکھی بلکہ سنی سنائی باتوں پر اعتراض کی بنیاد رکھی ہے یا پھر قادری صاحب عربی سے اقتصاد و واقف معلوم ہوتے ہیں کہ وہ اقتصاد "اور نسخ" کے فرق کو نہیں سمجھ سکے۔ عربی سے ماواقفیت کے اس شبہ کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ اپنی کتاب "جنگ آزادی" کے ص ۶۲ پر مولانا کی اس کتاب کا نام "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" لکھا ہے، جو کہ کتابت کی ضابطہ منہم نہیں ہوتی بلکہ محسوس یوں ہوتا ہے کہ بیسے "اقتصاد" اور "نسخ" کے فرق کو نہیں سمجھ سکے، شاید اسی طرح یہ بھی نہیں سمجھ سکے کہ "مسائل الجہاد" مرکب اضافی یہاں دوست ہے یا "المسائل الجہاد" مرکب توصیفی!

مولانا ثنائویؒ کے رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" کے متن سے تو کیا اس کے بیانیہ اسلوب یا کسی حاشیہ میں بھی مفسوخی جہاد کے تعلق ایک لفظ تک نہیں بلکہ اس رسالہ کا پس منظر اور سبب تصنیف صرف یہ ہے کہ بس دور میں انگریزوں نے مجاہدین کو اپنے ظلم و ستم کا حجتہ مشق تبارک کا تھا اور برادران اخاف بھی اپنے مجاہدین بھائیوں کے بجائے انگریز بہادر کی طرف دست تعداد و راز فرما رہے تھے، تو انہی دنوں مسلمان مجاہدین کے ازلی وابدی دشمن ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی رسوائے زمانہ کتاب

لکھی جس نے انگریزوں کے ظلم و استبداد کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اپنی صلیبی ذہنیت کے مطابق آجہانی ڈاکٹر ہنٹر نے اس کتاب میں اسلام اور مسلمانوں پر بے بنیاد الزامات عائد کیے، اسلام کو چند تشدد آمیز اصولوں کا مجموعہ قرار دیا اور عام مسلمانوں کی طرف یہی آٹھ دیا کہ اسلام نہ دہشت گردی کا پتلا ہے نیز اس نے لکھا کہ ایک واضح العقیدہ مسلمان کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ کسی حالت میں بھی غیر مسلم حکومت کی اجتماعی تسلیم نہ کرے بلکہ انہیں اپنے ملک سے نکال دے یا خود ہجرت کی راہ اختیار کرے۔ ڈاکٹر ہنٹر نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ اسلام میں ہر گز میں جہاد فرض ہے اس لیے ہندوستانی مجاہدین بھادرات پر مجبور ہیں مگر غرض ہنٹر نے اپنی اس کتاب کے باب "وہابیت" میں اسلام پر نہایت رنگ چلے کیے اور اہل حدیث کے

خلافت انگریزوں کو بہت اکیسا کیونکہ اس وقت صرف یہی ان کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔

مولانا تھلوی نے جب ہنٹر کی کتاب میں ان بے سرو پا اعتراضات کو ملاحظہ فرمایا تو انہوں نے خالص علمی اور نہایت متین انداز میں ایک ایک کی تردید فرمائی اور نام اس کا الاقتضا فی مسائل الجہاد رکھا۔ اپنے اس رسالہ میں مولانا نے کتاب و سنت اور کتب فقہ کے لائل کی روشنی میں اسلام کے نظریہ جہاد کی وضاحت فرمائی اور لکھا کہ جہاد کی فرضیت کے لئے کچھ شرائط ضروری ہیں، جب تک وہ محقق نہ ہوں، جہاد فرض نہ ہوگا، چنانچہ مولانا نے جہاد کی غرض و غایت کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھا تھا کہ:-

”مذہبی جہاد نہ اس غرض سے مشروع ہے کہ کافروں کو دنیا میں کفر کی مڑا دیں اور نہ اس غرض سے ہے کہ ان کو جبراً مسلمان کریں۔ اس جہاد سے غرض جو خدا و رسول کی کلام سے سمجھ میں آتی ہے یہ ہے کہ مسلمانوں کو مخالفینِ مذہب کی مخالفت بے باک سے بھائیوں اور خدا کی عبادت و بومخلوق کی پیدائش اور رسولوں کی بعثت سے معصود و ندادندی ہے، کارائے صاف کریں اور اس راستہ سے روکنے والوں کو راستہ سے ہٹا دیں۔“

الغرض یہ تھی وہ بات جسے قادری صاحب نے منکر بنا دیا ہے یہ سعادت تو صرف اسلاف و یونہی و اربابِ بدایوں و بریلی کے حلقہ میں آتی تھی کہ انہوں نے جہاد کی مخالفت اور انگریزوں کی موافقت میں فتوے دیئے۔ رہے ”وہابی“ یا ”اہل حدیث“ مجاہدین اسلام تو انہیں ایک طرف برادرانِ یوسف نے ہمت تراشیوں کا ہدف بنا رکھا تھا تو دوسری طرف انگریزوں نے آلام و مصائب کا تختہِ دمشق اور یہ مزیت و استعانت کا پہاڑ بنے ہوئے کہہ رہے تھے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں اہل حق کیساتھ یہی جو آیا ہے۔

کس روز تمہیں نہ تراشا کیے مدد؟ کس دن تباہی پر نہ آئے چلو کیے!

آفریں مجھے ایک بات اور بھی عرض کرنا ہے اور وہ یہ کہ ماضی قریب میں ہمیں جن صدات سے دوچار ہونا پڑا ان میں سے امیر المجاہدین حضرت صوفی محمد عبداللہ صاحب بانی دارالعلوم تعلیم الاکلام ماموں کا بھتیجہ خلیفہ لاہور اور حضرت مولانا سید ابوبکر غزنوی وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا راہبرانے عالم جہاد دانی ہونا سرفہرست ہے۔

حضرت صوفی صاحب نور اللہ مرقہ کو تو اللہ تعالیٰ نے جہاد میں عملی طور پر شرکت کی سعادت بخشی تھی، وہ اسماعیل شہید کے قافلہ کے آفری سالار تھے۔ ان کا ہر سہوٹن موراہ خدا میں جہاد کی محبت سے سرشار تھا۔ ان کی مجلس میں سب جہاد کا ذکر آتا تو ان کی بوڑھی رگوں کے خون کی گردش اور سفید بالوں کی چمک دمک تیز ہو جاتی اور اس رخِ آبشیں کی تب و تاب میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا تھا۔ آہ! ان مردِ مجاہد کے وصال سے ہماری صفوں میں کتنا عظیم خلا پیدا ہو گیا۔

آہ! ۲۵ اپریل ۱۹۷۶ء کی شام بھی کس قدر ایسا انگیز تھی، جب کہ لندن کے اُفق پر پاکستان ہی نہیں عالم اسلام کا ایک بے مثل آفتاب غروب ہو گیا تھا، میری مراد حضرت ابوبکر غزنویؓ سے ہے۔ خاندانِ غزنویہ کے چشم و چراغ، بطلِ حریت مولانا سید محمد داؤد غزنویؓ کے لختِ جگر اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر حضرت سید ابوبکر غزنویؓ کے متعلق یہ تو سب جانتے ہیں کہ مرحوم پیکرِ شرافت، مجسمِ اخلاق اور نہایت منکر المزاج تھے۔ مرغبانِ مریخِ طبیعت کے مالک تھے جس محل میں ہوتے کشتِ زعفران بن جاتی، مزاج کے درویش، دل کے بادشاہ، دماغ کے غنی، زبان کے دھنی، علم و فضل کے پہاڑ، حسنِ عمل کے بکرِ زخار، تہجدنار اور شبِ زندہ دامتھے معلوم ایسا ہو تاکہ احسن الخالقین نے حبِ الہی، عشقِ رسول، علم و عمل، سوز و گداز اور حسن و جمال سے ایک آئینہ بنایا اور نام اُس کا ابوبکر غزنوی رکھ دیا لیکن شاید یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان تمام اوصافِ حسنہ کے ساتھ

ساتھ آپ کے قلب اطہر میں ولولہ جہاد فی نہایت شدت سے موجزن تھا اور آپ حضرت
امیر المجاہدین صوفی محمد عبداللہ صاحب کی سمیت میں تحریک احیائے دین کی تنظیم کے لیے بھی
بے پناہ تڑپ رکھتے تھے۔ آپ نے مجاہدیت سرور عبدالقیوم صاحب سابق صدر آرڈینر
کے نام سے ۱۹۶۵ء میں اپنے ایک مکتوب میں اس عزم کا اظہار فرمایا تھا کہ :-

”وقت کا اہم تقاضا ہے کہ حضرت مولانا فضل الہی صاحب کی تحریک

مجاہدین کو منظم اور باضابطہ طور پر از سر نو زندہ کیا جائے :-

تحریک مجاہدین کے سلسلہ میں مثبت اور نادمہوس نریچر کی اشاعت کو بھی آپ نہایت
مزدوری سمجھتے تھے، چنانچہ راقم الحروف کے ذمہ بھی انہوں نے دو عنوانات پر کام کرنا لگایا تھا
جسے ان شاء اللہ ضرور کیا جائے گا سیر دست مجھے ان دونوں مقدس شخصیتوں سے محبت رکھنے
والوں کی خدمت میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آئیے

صحیح طور پر ان کے نقش قدم پر چلیں ۔

علمی خاکوں میں رنگ بھریں ۔

تحریک احیائے دین کو زندہ کریں ۔

اور

ذکر و فکر الہی کی مجلسوں کو گرم کریں ۔

کتاب کو تصنیف ہوئے چونکہ ایک سو سال کا عرصہ ہو رہا ہے ۔ اتنے طویل عرصہ میں
زبان نے کئی قلابازیاں کھائی ہیں، پہلے شمار الفاظ و محاورات ایسے ہیں جو کل مانج تھے لیکن آج
متروک ہو چکے ہیں یا ان کی شکل و صورت میں تغیر و دما ہو چکا ہے ۔ ایسے الفاظ و محاورات
ہمارے جدید قارئین کرام کی طبع نازک پہ بہت گراں گزرتے ہیں ۔ لہذا قارئین کرام کی اس مشکل
کو برادر عزیز محمد سرور طارق نے اس طرح حل فرمادیا ہے کہ انہوں نے جدید انداز میں اس

کتاب کو مرتب کر دیا ہے، جس سے کتاب کے آبدار گیسوؤں میں پھٹے کی نسبت بے پناہ
آب و تاب پیدا ہو گئی ہے ۔ لہذا وہ ہماری طرف سے شکریہ اور مبارکباد کے بطور خاص مستحق
ہیں ۔

برادر عزیز محمد سرور طارق، اپنے پہلو میں ایک درد مند اور تساس دل رکھنے والے
صالح نوجوان ہیں ۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ اس کم سنی اور فزنی کے عالم میں اس بات کے کتنے
شدید متمنی ہیں کہ تحریک جہاد میں پھر سے زندگی کی روح پھونکی جائے ۔ اسماعیل شہیدؒ کے جلائے
ہوئے چراغ کی روشنی کو جلا بخشی جائے اور سرزمین پاکستان میں آئین محمدی کے نفاذ کے
لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو کھپا دیا جائے جبکہ ان کے ہم عمروں کے ماحیہ خیال پر بھی اس
قسم کی باتیں نہیں کشک سکتیں ۔ یہی ہے ط

ہو نہار بروا کے چکنے چکنے پات

اس قسم کے صالح جذبات ہی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے ”کالا پانی“ جیسی ولولہ آفریں
کتاب کی ترتیب و تہذیب کے فرائض انجام دیئے تاکہ قارئین کرام اس سے باسانی
استفادہ کر سکیں ۔ خدا تعالیٰ ہمارے بھائی کی عمریں برکت فرمائے ۔

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار

ستاروں پر گنڈ ڈالنے والے ایسے شاہین صفت جوان ہی قوم کا اصل سرمایہ ہیں، ہمیں
مستقبل میں ان سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں ۔ برادر محمد طارق صاحب کی خدمت میں
یہ گزارش ہے ۔

جیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں

خدا کرے کہ جہاں تری رہے بے داغ و

محمد خالد سیف

۱۲، ربیع الاول ۱۴۰۶ھ

پیش لفظ

انڈمان سے واپسی کے بعد جب ہر دوست نے مجھ سے میری سیدہ قید، سفر اور ان جزائر کی کیفیت پر چھٹی شروع کی تو میرے لیے ہر ایک کے سامنے بیس سالہ تاریخ کو بیان کرنا نہایت دشوار تھا۔ اس لیے میں نے اس مدت میں پیش آنے والے اہم واقعات کو نہایت اختصار کے ساتھ سپرد قلم کر دیا ہے تاکہ ہر سائل اور مستفسر کے سامنے اس کتاب کو پیش کر دوں۔

جب اپریل ۱۹۴۷ء میں میں نے تاریخ پورے میری سیدہ قید "تاریخ عجیب" لکھی تھی تو اس سے چند دن قبل گورنر جنرل ہند نے میری رہائی کی درخواست کو مسترد کر دیا تھا، جس سے اکثر حکام بلکہ خاص و عام کو یقین ہو گیا کہ اب قید فرنگ سے مجھے بھی نجات نہیں ملے گی لیکن میں محبت الہی سے ناامید نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے کتاب مذکور کے دیباچہ میں لکھ دیا تھا "دنیا باریہ قائم ہے، دیکھیے پردہ غیب سے اور کیا ظاہر ہوتا ہے" بلکہ دیباچہ کے اختتام پر ناظرین فرام کی خدمت میں التجا بھی کی گئی تھی کہ وہ میرے حق میں دعا کریں کہ ہماری سرکار اس خاکسار کو ان ننگ و دھڑنگ جنگیوں کی محبت سے جُدا کر دے تاکہ اس کتاب کی جلد دوم ہندوستان آکر اپنی ملکی زبان میں ہدیہ ناظرین کر سکوں۔

اس دل سوز تحریر کو ابھی چند روز ہوئے تھے کہ میری درخواست کے بغیر فیسی مدد سے میری رہائی کا سامان ہو گیا اور لاڈلہ پن نے میری رہائی کا اعلان کر دیا۔ میری پہلی کتاب "تاریخ عجیب" کا نام بھی تاریخی ہے اور اتفاق حسنہ کی بات ہے کہ صرف ایک حرف ۱۲۹۲ھ زیادہ کر دینے سے اس کتاب کا نام "تواریخ عجیب" بھی تاریخی ہو گیا اور اس طرح چھ برس کی زیادتی بھی پوری ہو گئی۔ گویا یہ اس کتاب کی جلد دوم ہے، جس کا دین واپس آکر لکھنے کا

دودھ کیا تھا۔

ناظرین باوقار کی خدمت میں عرض ہے کہ میں نے اس کتاب کو روزمرہ کی بول چال میں لکھا ہے اور جہاں تک مجھے یاد تھا دوسرے لوگوں کے مقولوں اور واقعات کو من و عن نقل کیا ہے۔ اس کے باوجود ارتقا ضائع بشریت کے مطابق مجھ سے کہیں کمی بیشی ہوئی ہو تو خداوند عالم الغیب مجھے معاف فرما دے اور مکتہ حسین اصحاب اور اہل قلم جہاں کہیں غلطی کھیں اپنے قلم غفر سے اصلاح فرمادیں اور میرے حق میں دعا کریں کہ جیسے اس عظیم ہلاکت انگیز قید فرنگ سے نجات بخشی، ایسے ہی وہ رب کریم دلی مراد پوری کر دے اور خاتمہ بالخیر کے ساتھ اس ہلاکت دنیا سے بھی نجات بخشے۔ آمین ثم آمین و ما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:-

کيا لوگ یہ خیال کیے ہوئے ہیں کہ صرف یہ
اَحْسِبِ النَّاسَ اَنْ يُّشْرَكَ ۚ اِنَّ
کھنے سے کہ ہم ایمان لے آئے پھوڑ دیئے
يَقُولُوا اَمَّا ۤاَوْهُمْ لَا يُفْقَهُونَ
جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے
وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ
کی اور جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں ہم نے
قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ
ان کو بھی آزمایا تھا اور ان کو بھی آزمائیں گے،
صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَذِبِیْنَ ۝
سو خدا ان کو ضرور معلوم کرے گا جو (اپنے ایمان
میں، سچے اور ان کو بھی جو جھوٹے ہیں۔

جہاں تک مجھے سمجھ اور علم ہے اس مقدمہ میں ہماری گرفتاری، اس آیت شریفہ میں بیان کردہ منشائیں ہندی کے مطابق صرف سچے اور جھوٹوں کی پہچان اور آزمائش کے لیے تھی ورنہ وعدہ حق موجود ہے کہ "وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الْكَافِرِیْنَ عَلٰی الْمُؤْمِنِیْنَ"۔ بے شک اگر یہ ہماری آزمائش نہ ہوتی تو ہمیں کبھی بھی انگریزی سرکار سے صلہ نہ پہنچتا اور بنوائے حدیث نبوی:-

يُسَبِّلُ السَّجُلَ عَلَى حَنْبٍ وَنَيْمٍ
آدمی کی دین و ایمان کی استعداد کے مطابق
آزمائش ہوتی ہے۔

اس مقدمہ میں ایمان کے دعویٰ داروں کی آزمائش کی گئی اور ظاہر کیا گیا ہے کہ اپنے
دعویٰ میں جھوٹے کون تھے اور سچے کون؟ یہ کتاب — تواریخ عجیب المعروف بکاپانی
— گویا اس آیت مذکورہ بالا کی تفسیر ہے۔

اس تہذیب کے بعد اب اصل مقدمہ ابتداء سے انتظار تک بیان کرنا ہوں۔ اگر
ناظرین کرام اس آیت مبارکہ اور حدیث شریفہ کے معنوں کو ذہن میں رکھیں گے تو ان پر
واقعات کے اسرار و رموز خود بخود آشکارا ہو چکے جائیں گے لیکن یاد رکھئے کہ ان کے سمجھنے کے
لیے ایمان درکار ہے — میں خود اپنی کم ظرفی، بے استعدادی اور ضعیف الایمانی
کے سبب اس مقدمہ کے ہزاروں غنیمتیں اسرار کو سمجھ نہ سکا۔

محمد یحییٰ عیسوی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

معرکہ امبیلہ

۱۸۶۳ء بمطابق ۱۲۸۰ھ کے آخر کی بات ہے کہ مغربی ہند کی سرحد کے قریب امبیلہ
سرکار کی زبردستی کی وجہ سے ایک عظیم جنگ شروع ہو گئی۔ جنرل چیمپلین صاحب اس جنگ کے
سپہ سالار تھے۔ امبیلہ کی گھاٹی میں پہنچ کر سرکاری فوج کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چیمپلین صاحب
میں سرکار کی بے جا مداخلت کو دیکھ کر علامہ عبدالغفور صاحب اخوند سوات بھی اپنے بہت سے
مریدوں کو ساتھ لے کر آموجہ و ہونے، ملکی خواتین اور افغان لڑکی اپنے بچاؤ کے لیے چاروں طرف
سے سرکار پر ٹوٹ پڑے اور مجاہدین کا وہ قافلہ اس کے علاوہ تھا، جن کی سرکوبی اور نیست و
نابود کرنے کے لیے چڑھائی کی تھی۔ الغرض بدعویٰ حفاظت خود اختیاری ہر کس و ناکس سرکار کے
مقابلہ کھڑا ہو گیا۔ مجاہدین نے حصول شہادت کے جذبہ سے سرشار ہو کر شجاعت کے خوب خوب
جوہر دکھائے۔ یہ جنگ اندھ جنگ و جہل دو تین بیسے جاری رہا اور تقریباً سات ہزار کشت و خون
میں تڑپ گئے، خود جنرل چیمپلین شدید مجروح ہوئے۔ پنجاب کی تمام پھاؤنیوں کی فوج کو اس
جنگ میں جمع کر دیا گیا تھا۔

ادھر یہ ہنگامہ برپا تھا اُدھر لارڈ آئمن وائسرائے ہند اپنی اس حرکت پر نادم ہو کر اپنی
ملک عدم ہوا اور ہندوستان بے گورنر ہو گیا۔

ایسے نازک وقت میں ۱۱ دسمبر ۱۸۶۳ء بمطابق ۲۸ جمادی
الثانی ۱۲۸۰ھ کو ایک ولایتی افغان غزن خان نے

سازش کا انکشاف

جو کہ پانی پت ضلع کرنا ل کی چوکی میں بطور پولیس سوار متعین تھا کسی ذریعہ سے میرے حالات معلوم کیے اور اپنے ذہنی فائدے کی خاطر ایک لمبی چوڑی اور بھونٹی داستان ڈپٹی کمشنر کرنا ل کو سنائی اور کہا کہ سرچہ پر بند دستاویز مجاہدین سے لڑی جانے والی جنگ میں، تھانیر کا فزیر احمد جعفر مجاہدین کی روپیہ اور آدمیوں سے مدد کر رہا ہے۔ ڈپٹی کمشنر نے یہ داستان سنی تو بذریعہ تادم ضلع انبالہ میں خبر بھیج دی کیونکہ ہمارا شہر تھانیر اسی ضلع میں واقع ہے۔

مگر داستان سرائی کر کے باہر نکلا ہی تھا کہ ہمارے ایک دوست ڈپٹی کمشنر کرنا ل کی ملاقات کے لیے ان کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ جن سے گفتگو کے دوران ڈپٹی کمشنر نے اس مخبرن کا ذکر بھی کیا۔ ملاقات کے بعد جب وہ دوست اپنے ڈیرے پر تشریف لے گئے تو انہوں نے اپنے ایک نوکر کاواٹائی سے بر میرا ہمسایہ تھا بطور انسوس اس واقعہ کا ذکر کیا۔ کاواٹا اسی وقت مجھے اطلاع دینے کے لیے تھانیر دوڑ پڑا۔ جب تھانیر پہنچا تو رات کافی بیت چلی تھی۔ سب سے پہلے میرے مکان پر آیا لیکن میں اندر سو رہا تھا۔ اس نے جب دروازہ بند دیکھا تو آرام کے وقت میں تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا اور یہ سوچا کہ صبح کے وقت اطلاع دے دوں گا۔ حقیقت یہ تھی کہ تقدیر اسے دروازے پر سے ہٹائے گی۔

اب انبالہ کی کیفیت سنئے۔ جب یہ تار انبالہ پہنچا تو میری خانہ تلاشی کے لیے وارنٹ جاری ہوا اور ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کپتان یار سن، پولیس کی ایک بھائی جمعیت کے ساتھ راتوں رات میرے مکان پر پہنچ گیا۔ قدرت الہی کا تاثر دیکھئے، ایک ہی وقت میں دو آدمی روٹا ہوتے ہیں۔ ایک کرنا ل سے مجھے خبر دینے کو اور دوسرا انبالہ سے میری خانہ تلاشی کو، کرنا ل دلا جو پیر خیر خواہ تھا پہلے پہنچا اور کچھ نہ کر سکا۔

چال کو تعسیر کے لکھن نہیں کرنا رو

سو نہ تیر ساری ٹرگر سیتی دے

دوسرے مناسب رات کے تین بجے میرے گھر پر پہنچ گئے، چاروں طرف سے گھون

کا محاصرہ کرنے کے بعد مجھے باہر بلایا۔ جب باہر نکلا تو دیکھا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس، خانہ تلاشی کے وارنٹ لیے میرے دروازہ پر موجود ہے۔ اس نے وارنٹ دکھائے اور کہا کہ مکان کی تلاشی دو۔ میں اسی وقت سمجھ گیا کہ دل میں کچھ کالا ہے۔ میں نے سوچا کہ تلاشی پہلے گھر کے اندر کی ہو تو بہتر ہے تاکہ میٹیک میں رکھی ہوا خط پولیس کے ہاتھ نہ لگے لیکن جو ہرنا ہے اسے کوئی شک سکتا ہے، باوجودیکہ صدر دروازہ کی اندرونی دہلیز میں بالکل اندھیرا تھا اور میٹیک کا دروازہ جو کہ شمالی جانب تھا۔ بالکل نظر نہیں آتا تھا، لیکن سپرنٹنڈنٹ صاحب اسی پر مصر ہوئے کہ پہلے میٹیک ہی کی تلاشی لی جائے۔

میٹیک میں داخل ہونے کے لیے دو دروازوں کا گھونٹنا ضروری تھا، جو کہ اندر سے بند تھے۔ میں نے چالاکانہ منشی عبدالغفور کا نام (جو اس کے اندر چند آدمیوں کے ہمراہ موجود تھے) لے کر بلند آواز سے کہا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب تلاشی کے لیے کھڑے ہیں، تم جلد دروازہ کھول دو۔ اس سے میری غرض یہ تھی کہ کسی طرح وہ لوگ تلاشی کی بات سمجھ کر، دروازہ کھولنے سے پہلے اس زہریلے خط کو چاک کر دیں۔ سپرنٹنڈنٹ نے میری پکار کو سمجھتے ہوئے مجھے روکا لیکن میں کہاں سننا تھا۔ میٹیک کے اندر والے گھبراہٹ میں میرے اشاروں کو نہ سمجھ سکے اور انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ اب میٹیک میں تلاشی ہونے لگی تو جس خط کا ڈر تھا، سب سے پہلے وہی پولیس کے ہاتھ لگا۔ اسی شام کو پکڑے جانے سے چھ گھنٹے پہلے تقدیر نے وہ خط میرے ہاتھ سے لکھوا رکھا تھا، خط امیر قافلہ کے نام تھا اور اس میں اصطلاحی لفظوں میں چند ہزار اشرفیوں کی روٹنگ کا ذکر تھا۔ اس کے علاوہ چند خطوط پارینہ بھی پولیس کے ہاتھ لگ گئے، جو کہ محمد شفیع انبالہ نے پٹنہ سے ارسال کیے تھے، اگرچہ ان خطوط میں کوئی مضمرات نہ تھی مگر ان سے پولیس کو محمد شفیع انبالوی اور اہل پٹنہ مثلاً مولانا کبھی علی، مولانا عبدالرحیم اور مولانا احمد اللہ وغیرہ (جو اس وقت تحریک مجاہدین کے ارباب عمل و عقد تھے) کی تلاشی و تفتیش کا بہانہ ہاتھ آگیا۔

منشی عبدالغفور جو کہ بہار کے ضلع گیا کے باشندے تھے اور میرے پاس مخبری کا کام

کیا کرتے تھے اور ایک لڑکے جاس نامی کو جو بھٹیک میں سویا ہوا تھا پولیس پکڑ کر لے گئی۔ اگرچہ میری نسبت انہیں قوی شک ہو گیا تھا لیکن وارنٹ گرفتاری اور گورنمنٹ کی منظوری کے نہ ہونے کی وجہ سے جو کہ ایسے مقدمات میں ضروری ہے پولیس نے مجھ سے کچھ تعرض کیا۔ پولیس کی واپسی کے بعد یہ بات فوراً طلب تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ میں نے اس خیال سے کہ چونکہ میرے گھر سے شہر تھوڑا دور تھا اور جنگ سرحد کی وجہ سے حکومت کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے فرار ہو جانا اور بڑی سی جانی بچانا مناسب سمجھا۔ اگرچہ میں پولیس کی حراست میں نہیں تھا مگر وہ چاندوں طرف سے ہوا سڑا لگاتے ہوئے، میری حرکات کو تاک رہتے تھے۔

میں نے اپنی والدہ ماجدہ کو کہ اس وقت بقید حیات تھیں اور اپنی بیوی سے صلہ مشورہ اور انہیں اپنے فرار پر راضی کر کے یہ داؤ لگایا کہ میں ۱۲ دسمبر ۱۹۴۷ء کو اپنے شہر سے روانہ ہو کر اول موضع پیرپلی میں، جہاں تحصیل اور تھانہ وغیرہ ہے، آیا اور تحصیل اور پولیس کے ملازمین سے بھی رائے لی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ سب نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ تم انبالہ جاؤ اور وہاں سے دریافت کرو یہ کیا مقدمہ ہے اور کس نے یہ تجبیری کی ہے؟

یہ سب صلاح مشورہ کرنے کے بعد میں بوقت شام براستہ سڑک کلاں پیرپلی سے انبالہ کو روانہ ہو گیا۔ اس وقت سٹ سے آدھی شہر محبت اور افسوس سے یہی من و دل رہے تھے۔ جب میں ایک گھوڑے پر سوار ہو کر چلا تو ہر کسی کو یقین ہو گیا کہ میں انبالہ جا رہا ہوں۔ جب تک دن کی روشنی رہی میں برابر سڑک پر انبالہ کی طرف چلتا رہا۔ کوئی میل بھر راستہ چلنے کے بعد جب خوب تاریکی پھیل گئی اور مسافر جی ڈور ڈور تک نظر نہ آتے تھے، تو میں نے سڑک کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لی اور تھانہ کے منقل اپنی زمین میں مقررہ جگہ پر ایک سبکے رات پہنچ گیا۔

جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ والدہ ماجدہ، بیوی، بچے اور بھائی محمد سعید میری آخری ملاقات کے لیے انتظار کر رہے ہیں۔ والدہ سے آخری ملاقات کر کے اور بیوی بچوں کو ساتھ لے کر ایک

عمدہ ہسپتال پر سوار ہوئے اور تیس میل کا فاصلہ طے کر کے سبج پانی پت پہنچ گئے۔ میں شہر کے اندر گیا بلکہ سڑک ہی سے بیوی بچوں کو رخصت کر دیا۔ اس وقت میں جس سے بھی رخصت ہوتا تھا، زندگی میں دوبارہ ملنے کی امید نہ تھی۔ ہسپتال والے سے میں نے کہا کہ میرے بیوی بچوں کو پانی پت میں پھونڈ کر تم ہسپتال کے کمرہ پار چلے جانا۔ یہ ہسپتال معیلوں کی جوڑی، جو تین سو روپیہ سے کم قیمت کے نہیں ہیں، ہم نے تین اس شرط پر بخش دی کہ کسی کو میرے بال بچوں کی خبر نہ دینا اور جب تک یہ معرکہ گرم رہے تھانہ نہ جانا۔ جس وقت ڈاک خانہ پانی پت کے سامنے میں ساری عمر کے لیے اپنے بیوی بچوں سے جدا ہوا اور میرا بچہ ان کے سامنے دہلی کو چلا، وہ حادثہ ناقابل بیان ہے۔ آج بھی وہ ایک ایک لمحہ میرے ذہن پر نقش ہے اور شب و روز کی گردشوں کے باوجود میں اسے بھول نہ سکا۔

انگلہ کے ذریعہ چالیس میل کا سفر طے کرنے کے بعد، دوسرے دن دہلی پہنچ گیا اور وہاں میاں نصیر الدین کی کوٹھی میں قیام کیا۔ میاں حسینی ساکن تھانہ، حسینی ساکن پٹنہ اور عبداللہ نامی ایک بنگالی سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں مؤثر الذکر پٹنہ سے کچھ اشرفیاں لے کر اسی دن آئے تھے۔ میں نے وہ اشرفیاں ان سے لے کر حسینی ساکن تھانہ کے حوالہ کرتے ہوئے اسے ہدایت کر دی کہ جیسے ممکن ہو اس بیت المال کو قافلہ تک پہنچا دو۔

حسینی تھانہ کو روانہ کرنے کے بعد، میں نے ان دونوں کو اپنے ساتھ پورب لے جانا چاہا کیونکہ معرکہ اہیلا اور میرے مکان کی تلاشی کے بعد پنجاب میں امن نہیں رہا تھا۔ اس وقت میں نے عمر کی ابھی تک صرف پچیس بہاریں دیکھی تھیں لہذا اس شباب کے زمانہ میں شہر جوش جنون کی مد تک تھا اور زمانہ کے نشیب و فراز کا کچھ خیال نہ تھا۔ بس ایک گن تھی کہ یہ خدا کا کام ہے، وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ میری تلاشی انبالہ اور اس کے مغرب میں ہو رہی ہوگی، اس طرف میری تلاش میں کون آئے گا؟

اسی گڑھ میں اس مذکورہ خیال کے باعث دہلی پہنچ کر، میں نے اپنے تئیں مخفی رکھنے کو ضروری

نہ سمجھا۔ اس لیے آزادوں سے گھومنے پھرنے لگا۔ ایک دفعہ اپنے معمولی لباس میں پانڈلی
 چوک تک بھی گیا تاکہ سواروں کے لیے کرایہ کی شکر م و غیرہ کا انتظام کیا جائے۔ ۱۵۔ دسمبر کو برقیوں
 کھل کھلا شکر م پر سوار ہو کر علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ راستے میں کاٹھی بان کو بہت سا انعام د
 اکرام دے کر چاہا کہ جس قدر ممکن ہو علی گڑھ جلیہ پہنچ کر ریل پر سوار ہو جائیں۔ مجھے خفیہ یقین تھا
 کہ جس چال سے آیا ہوں، شاید کوئی مدت تک بھی میری حاشش کو ادا نہ آئے۔ میں اپنی بات
 پر اتنا نازاں تھا کہ تقدیر کا خیال بھی نہ رہا تھا۔ اب مجھے یہیں چھوڑ دیئے اور پولیس انسپار کی
 کارروائی سنئے!

ادھر پنجاب میں بابا بکامیر کی تلاش شروع ہو گئی تھی کہ میری گرفتاری کے لیے دس ہزار روپیہ کا انسانی اشتہار جاری ہوا۔ انبالہ کیس میں محمد شفیع کے مکان کی بھی تلاش ہوئی، اتفاق سے وہ اس وقت گھر پر موجود نہیں تھے بلکہ لاہور گئے ہوئے تھے۔ ان کے بھائی محمد رفیع اور ان کے کاغذ سے ملانا محبت علی اور منشی عبد الکریم وہاں موجود تھے لہذا ان کو گرفتار کر لیا گیا اور ڈرایا گیا کہ اگر تم صورت حال سے آگاہ نہیں کرو گے، تو تمہیں تختہ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔ جان کے قور سے محمد رفیع اور محمد تقی نے محمد شفیع کے منہ شہادت دے دی اور پولیس کے کہنے کے مطابق گواہی دے کر اپنی جان بچائی۔ منشی عبد الغفور نے شہادت نہ دی لہذا انہیں بلا قصور محمد شفیع کے ساتھ بے قید کر دیا گیا۔

علی گڑھ میں گرفتاری

علی گڑھ میرے گھر سے دو سو میل کے فاصلے پر تھا۔ جب ہم علی گڑھ پہنچے تو اسی وقت تار پہنچ گیا۔ لہذا اسی وقت برلین سڑک پولیس نے آکر ہمیں گھیر لیا اور ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ علی گڑھ کے بنگلہ پر بلے گئے، اس نے ہمیں مجسٹریٹ صاحب کے پاس بھیج دیا۔ جہاں مجھے اور میرے دونوں ساتھیوں کو تدارک کے جواب ثانی آنے تک حالات میں بند کر دیا گیا۔ اسی دن شام کو جب میں تیم کر کے نماز پڑھ رہا تھا تو پارسن صاحب وہاں پہنچ گئے اور مجھے قید میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور حکو دیا کہ اس کو پچاسی ٹھہری نہایت حفاظت کے ساتھ بند کر دو۔ حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور انہیں ایک بڑی تنگ و تاریک اور کال کوٹھی میں بند کر دیا گیا اور گرد و دین چروار

علی گڑھ میں گرفتاری

متیقن کر دیئے گئے۔

پھانسی گھر میں بند ہو کر مجھے قتل آئی گلاس فرار اور تدبیر پر فخر خداوند تعالیٰ کی مرضی کے خلاف تھا۔ اس فرار سے یہ مقدمہ بہت بھاری ہو گیا اور پھر مجھے یا میرے عزیزوں اور دوستوں کو جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، وہ اسی فرارنا بجا کاثرہ تھا۔ آزمائش کے وقت بھاگ جانے والے عاشقوں کا کام نہیں ہوتا۔ بقول سائنس

بیگانہ راجہ کار بود در بلائے غم

آزار سد کہ خاص بود آشنائے ما

علی گڑھ کے پھانسی گھر میں قید تھا کہ ایک رات پرے دار پوچھنے لگے "پھانسی والے مجرم پر بھی مرن ایک پہرہ ہوتا ہے، تم ایسا کیا تصور کر کے آئے ہو کہ جس سے تم پر تین پہرے لگائے گئے ہیں؟" میں نے جواب دیا "میں جس آقا کا غلام تھا، اس کے حکم کے بغیر بھاگ نکلا لہذا وہ ناراض ہو گیا اور مجھے راستہ ہی سے پکڑوا دیا۔"

جیل میں ناقص خوراک جیل کا کھانا سب سے پہلے اسی جیل میں پکھا، جو دو روٹیوں اور تھوڑے سے ساگ پر مشتمل تھا۔ ساگ میں موٹے موٹے

ڈنٹھل تھے۔ یہی کا نام تک نہ تھا۔ اس لیے ان کا چبانا بھی دشوار تھا۔ روٹیوں میں چور تھا کی کے قریب ریت اور مٹی ملی ہوئی تھی۔ خدا کا شکر ادا کر کے اس میں سے تھوڑا بہت کھایا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً اکثر جیل خانوں میں رہ کر دیکھا، سب جگہ قیدیوں کو اسی طرح کا کھانا ملتا تھا۔ دراصل بات یہ ہے کہ قیدیوں کو خوراک کم ملتی ہے جس سے ان کا ہیٹ نہیں بھرتا۔ جب انہیں گندم پینے کے لیے دی جاتی ہے، تو وہ بھوک کے مارے سیروں گندم چبا جاتے ہیں یا کچا آم پانی میں گھول کر پی لیتے ہیں اور آٹے کا وزن پورا کرنے کے لیے آٹے میں مٹی یا ریت ملا دیتے ہیں اسی طرح جو عمدہ ترکاری بیل کے بانوں میں پیدا ہوتی ہے، اس کو تو فروخت کر دیتے ہیں یا جیل کے عمدہ دار کھا جاتے ہیں اور ناکارے ڈنٹھل جن کو جانور بھی نہیں کھاتے، کاٹ

کاٹ کر قیدیوں کے لیے پکا دیئے جاتے ہیں۔ وہ بھوک کے اسی کو قیمت جان کر ہاتھوں ہاتھ اڑا جاتے ہیں۔ اگرچہ نئے قیدیوں کو ایک دو دن ضرورت ہوتی ہے، مگر جب بھوک سے پیٹ میں قراقرٹ اٹھتے ہیں تو پلاؤ قورے سے بھی زیادہ اس میں مزہ پاتے ہیں اور کھا جاتے ہیں کیونکہ دنیا میں اصل مزہ بھوک کا ہے۔

دوسرے دن پارسن صاحب خوشی خوشی ہم تینوں آدمیوں کو لے

امتحان عشق

کر بذریعہ شکرم دہلی روانہ ہوا۔ شکرم میں سوار ہونے سے پہلے

مجھے بڑی "تھلڑی" اور طوق پہنا کر اور طوق میں بطور باگ ڈور ایک زنجیر ڈال کر اور اس کا سرا ایک مسلح سپاہی کے ہاتھوں میں دے کر اس کو میرے پیچھے بٹھایا۔ پارسن صاحب اور دوسرا سپاہی پولیس میرے دائیں بائیں بھرے ہوئے تینوں کی جوڑیاں لے کر اور میرے بدن سے بدن ملا بیٹھے گئے۔ راستہ میں پارسن مجھے بار بار کہہ رہا تھا کہ اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی، تو میں اس تینے سے تمہیں مار ڈالوں گا۔

علی گڑھ سے دہلی تک کھانا پینا تو درکنار، کسی سخت ضروری حاجت کے لیے بھی نہیں نہ اتارا گیا۔ جب نماز کا وقت آتا، تو میں اجازت کے بغیر ہی تیمم کر کے بیٹھے بیٹھے اسٹاروں سے نماز پڑھ لیتا تھا۔ گاڑی بدستور سوتے منزل رواں دواں رہتی اور وہ چپ چاپ میری نماز کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔ آخر کار بڑی مصیبت کے ساتھ، لوہے میں جکڑے ہوئے، دہلی میں داخل ہوئے، جہاں ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس دہلی کے بنگلہ کے ایک تہ خانہ میں ہمیں زندہ درگور کر دیا گیا۔

دوسرے دن ہمیں دہلی سے کرنال اور کرنال سے

دہلی سے انبالہ تک

انبالہ لے گئے۔ جب انبالہ پہنچے تو رات بھیگ

چکی تھی۔ ہمیں بے آب و دانہ تین علیحدہ علیحدہ پھانسی گھروں میں بند کر دیا گیا، چنانچہ ہم اپریل کے شروع تک یہیں بند رہے۔

دوسرے دن فجر کے وقت سیر خٹہ نٹ پارسن۔ سیر بام فیلڈ اپنی اسپرٹ بڑا پرانیس اور کپتان مانی ڈپٹی کپتان انبالہ یا جون مابون کی طرف میری کوٹھڑی میں آنے اور مجھ سے کلام اس مقدمہ کا سب حال بتا دو، تو یہ تمہارے لیے بہتر ہو گا۔ میں نے کلام میں کچھ نہیں جانتا۔ پارسن نے پہلے تو مجھے بہت ڈرایا دھمکایا اور پھر مارنا شروع کیا۔ جب مارا ہٹا کو پہنچ گئی تو میں گر پڑا مانی صاحب اور جارج فیلڈ کو کھڑی سے باہر کھڑے ہو گئے۔ جب اس قدر تشدد پہنچی میں نے کچھ نہ بتایا، تو وہ سب اس دن مایوس ہو کر چلے گئے۔ تب میں نے غم و قہی کی کیفیت دیکھی، تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میرے ذمہ رمضان المبارک کے کچھ روزے باقی تھے، دوسرے دن سے میں نے ان کی قصاص کرنی شروع کر دی۔

دوسرے دن میں روزے سے تھا، علی ایسیج پارسن صاحب آیا اور دینی کارروائی شروع کر دی۔ تھوڑی زد و کوب کے بعد مجھے اپنی جگہ میں بٹھا کر ڈپٹی کمشنر مانی صاحب کے ہنگامے پر لے گیا، جہاں ثانی اور بام فیلڈ دونوں موجود تھے۔ انہوں نے بڑی چالوسی کی اور کہا کہ ہم تحریری عہد کرتے ہیں کہ اگر تم دوسرے شرکار اور معاونین جہاد کے نام بتا دو تو تمہیں سرکاری گواہ بنا کر رہا کر دیں گے اور ایک بڑے عہدے پر بھی فائز کر دیں گے۔ بصورتِ غیر تمہیں پھانسی کی سزا دی جائے گی۔ میں نے اس چالوسی پر بھی انکار کر دیا۔

پھر پارسن صاحب ان دونوں سے انگریزی میں کچھ باتیں کر کے، مجھے ایک الگ کمرے میں لے گیا اور وہاں پھر مارنا شروع کیا۔ میں کہاں تک لکھوں آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو لیکن بغیر اللہ میں نے سب کچھ برداشت کر لیا اور ہر دم اپنے رب سے دعا کی "اے رب ذوالجلال! یہ امتحان کا وقت ہے، تو مجھے ثابت قدم رہنے کی توفیق عنایت فرما۔" جب وہ ہر طرف مایوس ہو گئے تو لپچا۔ ہر کراہوں نے آٹھ بجے رات مجھے واپس جیل خانہ میں بھیج دیا۔

میں تمام دن روزے سے تھا، ہنگامے سے باہر نکل کر درخت کے پتوں سے روزہ افطار

کر لیا۔ جیل میں پہنچ کر جو میرے مقدمہ کا کلام رکھا ہوا تھا کھایا اور ٹکڑا لٹی بجا کے سو گیا۔

بیس دن مانی صاحب کے ہنگامے پر مار پیٹ کی لذت اٹھا رہا تھا، اس وقت منشی زید علی صاحب تھان پوری تحصیلدار نرائن گڑھ اپنے عہدے سے معطل ہو کر باہر آمدہ میں ٹھہر گیا تھا۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے چند برس پہلے، اپنے کسی دنیاوی معاملہ میں مجھے ایک خط لکھا تھا اور پھر میری کتب خانہ میں اس سے دشمنی کی بنا پر، اس کے معنی غلط بیان کر دیے تھے۔ میں اس کا ٹھیک چہرہ دیکھ کر اپنی تحلیف بھول گیا اور دل میں خیال آیا کہ مجھے تنہا اس اور مالالی کو ایک خط لکھنے کی وجہ سے یہ بے پایاں بے کلام پڑا گیا۔ اگر اس کے بجائے مجھے ہی سزا ہو جائے اور یہ باہر جائے تو یہ بہت بہتر ہے۔ میں اپنی حالت زار کے باوجود اس کے لیے بہت دعائیں کرتا رہا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ ناکر وہ کلام بری ہو کر اپنے عہدہ پر بحال ہو گیا اور اب تک پنجاب میں اول درجہ کا عہدے دار ہے۔ اس دن کے بعد کچھ بھی مجھے سرکاری گواہ بننے کی ترغیب نہیں دی گئی۔

جب میری طرف سے قطعی مایوسی ہو گئی تو فدر فیر اور مولوی محمد تقی کو مخبر بنا کر رہا کر دیا گیا۔ انہیں کہ بیان سے بے چارہ محمد شفیع لاہور سے پکڑا گیا تھا جس کا اس مقدمہ سے بہت ہی تھوڑا تعلق تھا۔ پھر انہی کی رہبری میں پارسن چنہ گیا تھا، جہاں ایشری پر شاد ملازم پولیس اور مسٹر ٹیلر جے جے جے میں مولانا احمد اللہ صاحب وغیرہ موجود کو بے قصور قرار دینے کی کوشش ہوئی۔ جسے جے جے جے میں مولانا احمد اللہ صاحب نے غصے سے دیکھا تھا۔ اس کے مددگار ہو گئے، ان کی نسبت سے اس نے مولانا کچی علی صاحب، مولانا عبدالرزاق صاحب، الٹی بخش اور میاں عبدالغفار کو گرفتار کر کے انبالہ بھیج دیا۔

پھر پارسن بکھال گیا، جہاں اس نے باجبا بہت سے لوگوں کو گرفتار کیا، ان میں سے اکثر تو لاکھوں، ہزاروں روپیہ غنیمت کر کے رہا ہو گئے اور بہت سے لوگوں کو پھانسی دینے کی دھمکیاں دے کر گواہ بنا لیا گیا۔ نہ تو ایک قاضی میاں جان ساکن کا کھلی ثابت قدم رہے، جاگرتا رہا ہر گز انبالہ

آئے۔ بعض اہل دین، علاؤ الدین سوداگر ان دہلی اور دوسرے بہت سے لوگ دہلی سے بھی گرفتار ہو کر آئے۔ پشاور سے بنکال کے مشرقی و شمالی کنارے تک شاید کوئی مالدار مسلمان، مولوی یا نمازی بچا ہو، جسے ایک دفعہ پولیس نے پکڑ کر، اس کی طاقت کے مطابق اپنی مٹھی گرم نہ کر لی ہو۔ یہ ہنگامہ داؤد گرجہ سے اپریل تک جاری رہا اور صد ہا آدمیوں کو ڈرا، دھمکا اور سکھلا کر گواہ بنالیا گیا۔

اس پارس گروہ کے زمانہ میں دو بے چارہ سینیٹا سری بھی دہلی سے اشرافیاں لاتے ہوئے پکڑا گیا اور کل اشرافیاں ضبط کر کے ہمارے ساتھ ہی بے تصور مرقید ہوا۔

غداروں پر نوازشیں ہم نے دیکھا ہے کہ اس مقدمہ میں بڑے بڑے صاحب لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے آئین اور قانون کو طاقی نہ کیا۔ مثلاً ایشری پر شاد وغیرہ نے اپنے فائدے کے لیے اس مقدمہ کو رتی سے سانپ اور رائی سے پہاڑ بنا دیا اور ہمیں پولین یا مہدی سوڈانی جیسا انگریز کا دشمن ثابت کر کے اپنا مطلب نکالنا چاہا! چنانچہ اسے کامیابی ہوئی اور وہ ایک ادنیٰ عہدے سے ڈپٹی کلکٹر ہو گیا نیز دسویں دے کر سرکار سے بڑی بڑی زمینداری اور جاگیر بھی حاصل کر لی۔ اسی طرح غزن خان نے اپنے بیٹے کے قافلہ کے بھیجنے کا ایک جھوٹا اور فرضی قلعہ کھڑ کر حکومت سے ایک دو گاؤں جاگیر لیے۔

۱۸۶۳ء کے اخیر سے لے کر دس برس تک ہندوستان کے مسلمانوں پر قیامت برپا رہی۔ مسلمان غوث کے مارے مگر بارہ چھوڑ کر عرب ملک میں ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ خود غوث خوشامدیوں اور ہمارے دشمنوں نے دل کھول کر ارمان پر سے کیے۔ دس برس تک اخباروں میں یہی قصہ موضوع سخن بنا رہا۔ برسوں تک اس دار و گیر کے لیے ایک باقاعدہ محکمہ موجود رہا جس کا کام ہی یہ تھا کہ جس کو چاہا پکڑ لیا، جو چاہا رشوت لے لی اور جس نے رشوت دینے سے انکار کر دیا، اپنے معمولی گواہوں سے گواہی دلا کر اسے مرقید کر دیا۔

شیخ الکل میاں نذیر حسین کی طلبی

ان کا صدر مقام تھا۔ انہوں نے دہلیوں کی حمایت کے جرم میں شیخ الکل حضرت میاں محدث دہلوی کو بھی دہلی سے راولپنڈی طلب کیا۔ ابھی کچھ کارروائی شروع نہ ہوئی تھی الحاکمین اور سرریح الانتقام کو اپنے برگزیدہ بندوں پر ظلم کی یہ کارروائی پسند نہ آئی اور اس نے چیمبرلین صاحب کی موت ناگہانی کے وارنٹ جاری کر کے اسے اپنی دربار عالی میں طلب کر لیا۔ اس کی موت کے بعد پھر کسی کو اس خطرناک خدمت کے قبول کرنے کا موصلا نہ ہوا، وہ مٹھی ٹوٹ گیا اور عزیز مسلمان اس غیبی تائید کے ساتھ اس آفت ناگہانی سے محفوظ ہو گئے۔ حضرت میاں صاحب محدث دہلوی جنہیں ہندوستان کے تمام اہل حدیث ممبروں کے نام ظاہر کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا، رہا ہو کر اپنے گھر تشریف لے گئے۔

ہمارے ہندوستانی مسلمان

خود غرض لوگوں نے ہماری بہادر اور دانا سرکار کے دل پر، ان سود و سو فقیروں کا ڈر اور رعب اس قدر جمایا اور اس میں ایسا مبالغہ کیا کہ گویا انگریزی سلطنت کا قلع قمع کرنے والے ہیں لوگ ہیں اور اس کا اثر جس قدر ہماری فاتح قوم پر ہوا ہے، وہ ڈاکٹر ہنزہ کی کتاب "OUR INDIAN MUSALMANS" کے دیکھنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس میں کیسے رسی کا سانپ اور رائی کا پہاڑ بنایا گیا ہے اور کن کن دلائل سے فاتح اور مفتوح قوم کے درمیان عداوت ثابت کی گئی ہے اور پھر طرہ یہ کہ علی العموم ہندوستان کے تمام مسلمانوں پر حملہ کیا گیا، حالانکہ اس تحریر کے بعد بڑے بڑے موقعوں پر خیر خواہی و خیر نگاہی کے جذبات پیدا ہوئے لہذا فاتح اور مفتوح کے دلوں کو بگاڑنے والی یہ کتاب ہرگز قابل اعتبار نہیں ہے۔

جب یہ کتاب چھپ کر آئی، اسی وقت مولوی سید احمد صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی نے بڑے دلائل سے اس خیالی پلاؤ ڈاکٹر کی تردید کر کے اس کی دھجیاں اڑا دیں اور

ہر دور میں برصغیر میں غلط ثابت کر دکھایا لیکن وہابیوں کو اپنا جانی دشمن سمجھنے والے انگریزوں پر ابھی تک اس کتاب کا بادواہ اثر باقی ہے۔ اگرچہ افغانوں نے پنجاب میں ملدارنی کے بعد اہل میں صدمہ بڑے بڑے معزز انگریزوں، میم اور پکوں کی گورنر جنرل تک کو مار ڈالا۔ اب بھی جہاں موقی پاتے ہیں، اپنی دشمنانہ حرکت سے باز نہیں آتے۔ ان کے دلیروں نے حتیٰ فتوے دے رکھا ہے کہ انگریزوں کا مارنا بڑا ثواب ہے لیکن اس کے باوجود انگریز افغانوں کو اپنا اس قدر دشمن نہیں سمجھتے جتنا کہ وہابیوں کو، ڈاکٹر بنڈ کے پھیلائے ہوئے تعصب کے باعث انہوں نے اپنا دشمن فرض کر رکھا ہے حالانکہ وہابیوں سے کسی انگریز کا قتل تو کجا، کسی خلافت تہذیب بات بھی سرزد نہیں ہوتی۔

۱۹۵۷ء میں جب کہ بغاوت اپنے عروج پر تھی۔ وہابیوں نے انگریزوں کی نیم اور پکوں کی مخالفت کی۔ انہیں اپنے گھر میں پھنسا دیا اور باغیوں سے محفوظ رکھا مگر ڈاکٹر بنڈ کی کتاب کی وجہ سے سرسید احمد خاں نے ڈاکٹر بنڈ کی کتاب "INDIAN MUSALMANS" پر "REVIEW ON DR. HUNTER'S INDIAN MUSALMANS" کے نام سے نہایت تفصیل سے تبصرہ کیا تھا جو کہ مختلف اخبار و رسائل میں شائع ہوا تھا، کئی مرتبہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں اقبال اکیڈمی لاہور کی طرف سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا تھا۔ مولانا تھانیسری کا یہ اشارہ حضرت شیخ الکل مولانا سید محمد زبیر حسین محدث دہلوی کے اس واقعہ کی طرف ہے کہ آپ نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے موقع پر ایک انگریز میم سرلینس کو پناہ دی تھی۔ اہل حدیث اور حضرت میاں صاحب سے مناد رکھنے والے بعض لوگ اس واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے انگریزوں کی آزادی کا الزام لگایا کرتے ہیں۔ اس لیے یہاں واقعہ کی اصلیت سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ حضرت میاں صاحب کا اس انگریز عورت کو پناہ دینا آپ کی عظمت شان کا ایک بقیہ ثبوت ہے۔ آپ نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے یہی آپ کے شایان شان تھا۔ قرآن مجید، احادیث نبوی اور فقہ کی رو سے حالت جنگ میں کافر قوم کے بڑھوسوں، بچوں اور عورتوں

سے دونوں قوموں کے درمیان تعصب، نفرت اور دشمنی بہت بڑھ گئی ہے لیکن مذاہم شیعہ ہے کہ ان گزشتہ پچیس برس کے تجربوں اور وہابیوں کی خیر خواہی نے ڈاکٹر بنڈ صاحب کی دروغ گوئی کو طشت از باہم کر دیا ہے: چنانچہ گورنمنٹ ہند کے حکم سے برکاری تحریرات میں ان کے لیے ہالی کے لفظ کا استعمال ایک قہر بند ہو گیا ہے اور آئندہ سے یہ لوگ اپنے نام محمدی یا اہل حدیث سے پیارے جائیں گے۔ گورنمنٹ کا یہ ایک حسن اقدام ہے۔ اس وجہ سے اگر کبھی موقع آ پڑے تو سرکار پر اپنی جان بچا کر کرنے سے بھی یہ لوگ دریغ نہ کریں۔

تو قتل کرنا بڑا بڑا نہیں بلکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: - "وَإِنْ أَسَدٌ مُنْتَقِیْنَ اُتْرَکِیْنَ اُسْتَبَارَکَ مَا جُوْذُ حَتّٰی یَسْمَعُوْا مَآرَ اللّٰہِ ثُمَّ اٰیْلٰہُ مَا مَنَعَ ذٰلِکَ بَاثِلُہُمْ قَوْمًا لَا یَعْلَمُوْنَ" ۵۰ اترا بیت ۱۶ ترجمہ یہ ہے کہ اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو اور اللہ کا قسم ہے کہ اگر اس کو اس کے امن کی بگڑ پناہ دو۔ یہ اس لیے کہ وہ جانتے نہیں: پس حضرت میاں صاحب نے ایک زخمی انگریز عورت کو مرث اس لیے پناہ دی کہ خدا و رسول کا مکرہین تھا۔ یہ قرآن مجید کی مذکورہ آیت کے مطابق عمل کرنے کا وقت تھا جو زندگی میں شاید کبھی میسر نہ آتا۔ ہوائیوں کے شہرہ رقبہ کے باعث اگرچہ آپ کو مشکلات کا علم تھا لیکن خدا و رسول کو خوش کرنے کا جتنی بڑا تھا: چنانچہ آپ نے ایک ایک لفظ پر عمل کر دکھایا۔ عورت کو پناہ دی، زخمی تھی اس کا علاج کیا، اللہ کا کلام سنایا اور چہرے اس کی قوم میں بچا دیا جو کہ اس کا "نامن" تھا۔

یہاں بھی اہل حدیث پر انگریز دوستی کا الزام لگانے والوں کے لیے غلطی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے (بعض کلمے پڑھتے، دوست غلطی میں مبتلا ہو گئے)، اس لیے ان سطور کے پس منظر کو بیان کر دینا ضروری ہے۔ مولانا تھانیسری نے سوانح احمدی یا اپنی کتاب "کاپانی" اس وقت تحریر فرمائی جب انگریز اہل حدیث کی مخالفت میں جنوں کی مدد سے پہنچ چکا تھا اور تحریک جہاد انتہائی مقہور تھی جس کو مجاہدین کو دار و سن اور قید و بند کی ایسی ایسی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا جن کے تصور ہی سے جسم تلے ہونے لگتے تھے۔ انگریز کی کوشش تھی کہ تحریک کو کچل کر مجاہدین کو صوفی بستی سے مٹا دیا جائے

مقدمہ انسبالح

دسمبر سے اپریل تک دارگیر کا یہ سلسلہ جاری رہا اور اپریل میں

یہ مقدمہ ضلع انبالہ کے مجسٹریٹ کے پاس پیش ہوا۔ ہم سب نوٹس کو پچاسی ٹھوں سے نکال کر کچری میں لے جایا گیا۔ کچری میں باکر معلوم ہوا کہ پچاسی کی دھکی دے کر میرے بھائی محمد سعید کو میرے اوپر اور محمد شفیع کے حقیقی بھائی محمد رفیع کو اس پر گواہ بنایا گیا ہے نیز پچاس ساٹھ دیگر آدمیوں کو بھی زبردستی گواہ بنایا گیا ہے۔ ان بے چاروں کی ٹب حالت تھی ایک طرف گواہی دے رہے تھے اور دوسری طرف ہماری جانب دیکھ کر زار زار رو رہے تھے۔ یہ بے بس اور مجبور محض تھے کیونکہ اگر گواہ نہ بنتے تو تختہ دار پر لٹا دیئے جاتے۔ اداے شہادت تک ان بے گناہوں کو قیدیوں کی طرح پولیس کے زیرِ حراست رکھا گیا۔ لباس اور خوراک کا انتظام رکارتی تھا، جس کی وجہ سے ان بے جا کارروائیوں پر حکومت کالاکھوں روپیہ خرچ ہو گیا۔

ایسے نازک ترین لمحات میں مولانا نے اپنی کتابیں مبادک برصغیر کی تاریخ اسلام کے اس سب سے زیادہ دشوار باب کے حالات طاقیسیاں کی زینت ہو جائیں۔ مولانا کے لیے حبِ محض کا عالم تھا اگر آپ عاقبت کو مرنے میں بیان کرتے تو پھر سے قید و بند کی تنہائیاں اور بے خبر و سلاسل کی سختیاں تھیں مگر ان سے تو آپ قطعاً خائف نہ تھے البتہ اس بات کا زبردست امکان تھا کہ حکومت ان کی اشاعت میں زبردست رکاوٹ ڈال دے گی یا تمام مواد ضبط کر لے گی اور یہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہو گا۔ اس لیے مولانا مرحوم نے حالات کے ان تقاضوں کے پیشِ نظر جہاں تک ممکن ہو اوقات میں لپک پیدا کر کے حکومت کی دستبرد سے محفوظ کرنے کی کوشش کی اس سلسلہ میں آپ سے فروگزاشتیں بھی ہوئی ہوں تو آپ معذور ہیں تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے۔ ”تذکرہ شہید“ ص ۲۱۵ - ۲۱۶ از محمد خالد سیف۔

مولانا محمد جعفر کے علاوہ پٹنہ کے مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم، حسین بن مکتو، انبالہ کے شیخ محمد شفیع، عبدالکریم، قاضی میر کے حبشی بن محمد حبشی اور میاں عبدالغفار، قاضی محمد بیان، جلالپور اور الٹی بخش بن کریم بخش انبالہ کے مقدمہ میں مانڈتے تھے۔

پولیس تشدد کی ایک مثال

پولیس کے ان بے گناہوں پر مظالم، تشدد اور

زور و کوب کا اندازہ اس سے لگائیے کہ عباس نامی ایک لڑکا، جس نے مدت تک میرے گھر میں رہ کر پرورش پائی تھی، جب مجھے دیکھ کر محبت کے مارے مجسٹریٹ کے پاس مجھوٹا اور آسوخہ بیان دینے سے بچکھپایا تو اسی روز رات کو اس بچے کو ایسی سخت سزا دی گئی کہ وہ تاب نہ لاتے ہوئے قبل از پیشی مقدمہ سیشن جی دم توڑ گیا مگر بدنامی کے ڈر سے بچنے کے لیے پارس نے یہ شرمکھ دیا تھا کہ اس کی وفات کسی مرض کی وجہ سے ہوئی ہے۔

جب ہم پہلے دن مجسٹریٹ میں حاضر کیے گئے، تو میرا بھائی بھی پولیس کے زیرِ حراست گواہوں

بھائی کا جھوٹی گواہی سے انکار

میں سے تھا۔ اس نے ایک سپاہی کے ذریعہ مجھے یہ اطلاع دی کہ پولیس نے مارپیٹ کر مجھے تمہارے خلاف گواہ بنایا ہے لہذا اب جس وقت برابر اجلاس بیان ہوں گے تو میں اپنے اس بیان سے پھر جاؤں گا، جسے مارپیٹ کی وجہ سے لکھوایا ہے۔ میں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میری آزادی اور قید خدا کے ہاتھ میں ہے، تمہاری گواہی پر حوت نہیں۔ اگر تم نے حلفیہ بیان دیا ہے تو پھر جانے کی صورت میں بکرم و روع حلفی تہیں سخت سزا ہوگی۔ میں تو پیٹ سے پھنسا ہوا ہوں تمہارے پھنس جانے کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ ضعیف والدہ صاحبہ شاید صدمہ کی تاب نہ لا سکیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جو بیان تم نے پہلے لکھایا ہے، اسی پر قادر ہو لیکن بائیں ہمد جب اس کا میرے سامنے بیان ہونے لگا تو وہ پہلے بیان سے منحرف ہو گیا۔ برابر اجلاس اس کا انکار سن کر صاحبِ لوگ پہلے تو بڑے برا فروخت ہوئے اور پھر اس کی صغریٰ کی وجہ سے اسے کوئی سزا نہ دے سکے اور اس کا نام گواہوں کی فہرست سے نکال دیا۔

گواہوں کی کثرت کی وجہ سے یہ مقدمہ ایک ہفتہ تک مجسٹریٹ کی کچری میں پیش ہوتا رہا۔ سب لوگوں کا تعصب ہم سے اس حد تک تھا کہ جب مقدمہ کی پیشی کے وقت ہم نے یہ درخواست کی تو

ہماری نماز کا وقت آگیا ہے لہذا ہم کو نماز پڑھنے کی اجازت بخشی جائے لیکن انہوں نے یہی یہ اجازت نہ دی کہ وہ ہمارا کیا کر سکتے تھے ہم نے عین دوران مقدمہ میں ایتم کر کے بیٹھے ہوئے اشاروں سے نماز پڑھ لی۔

مقدمہ سیشن سپرو ایک ہفتہ کی کارروائی کے بعد ہمارا مقدمہ پیر سیشن ہوا۔ اس وقت تک ہم پچاسی گھروں میں علیحدہ علیحدہ قید تھے۔ سیشن پردگی کے بعد ہم سب کو حوالات میں ایک جگہ بند کر دیا گیا۔ ایک مدت کی چٹکشی کے بعد ہم سب دوست ایک جگہ جمع ہوئے تو ہماری سرت کی انتہا زنجی میں تو اکثر سعدی کا یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔

پائے در زنجیر پیش درستان

بر کہ با بیگانگان در برستان

گرچہ ماہ کے اس تخلیہ اور تنہائی سے مجھے ہم نگران کو بہت روحانی فائدہ ہوا تھا قلب کے آئینہ صافی میں انوار الہی خوب محسوس ہوتے تھے۔ نماز روزے میں کمال لذت حاصل ہوتی تھی کہ شاید وہ کیفیت برسوں کی بند کشی اور گوشہ نشینی بھی حاصل نہ ہوتی۔

مولانا یحییٰ علی کی صحبت اس وقت محمد شعیب اور عبدالحکیم تو کسی قدر کشیدہ خاطر رہا کرتے تھے لیکن مولانا یحییٰ علی صاحب کی صحبت غایت

ملہ حضرت مولانا یحییٰ علی صاحب، مولانا احمد اللہ کے برادر، مسٹر اور حضرت کو فائدہ دولت علی صادق پور کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ہیستہ ان کے ساتھ رہنے اور پاکستان کی لڑائیوں میں دست راست۔ جس دوام بہرہ و دیارے شہر کی سزا کاٹتے ہوئے ۲۶ شوال ۱۳۹۲ھ ۲۰۰۱ء فروری ۱۹۹۹ء کو انڈیا میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ غلط فہمی سے تا کرہ صادق ص ۶۳ - ۷۸ سرگزشت مجاہدین ۳۷۲

۱۳۲۲، ۲۳، ۲۴ ہندوستان کی پہلی اسلواں تحریک ص ۱۰۶ - ۱۰۷ - ۱۰۸ - ۱۳۸

سے کم نہ تھی۔ اسی طرح ہم باقی نو آدمی بھی اس حوالات میں نہایت شاداں اور فرحان تھے اور یہ خاکسار تو جب اپنی ذلیل النفسی اور کم علمی کے مقابلے میں ان انعامات الہی اور اس سرفرازی کو دیکھتا تو سمجھتا تھا کہ میری مثال تو ٹھیک اسی طرح ہے، بیسے سفارش، استحقاق اور ذاتی ثبات کبھی بغیر ہی کسی چار کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا جائے۔ اللہ اللہ! میرا حسب نسب اور لیاقت کہاں اور راہ خدا کے امتحان میں ثابت قدم رہنے کی یہ سرفرازی کیسی! اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ ایسے امتحانوں میں پیغمبر اور صحابہ کرامؓ بھی گھبرا جاتے تھے۔ اس صبر اور استقلال کو انعام خداوندی سمجھنے کی وجہ سے میری زبان تو ازل سے آخر تک شکر کے ترانوں سے لبریز رہی۔

مولانا یحییٰ علی صاحب کی کیفیت تو اس سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر تھی۔ آپ اکثر ان اشعار کو پڑھا کرتے تھے۔

قلت ابالی حین اقتل مسلماً علی ای شتی کان فی - اللہ منہ

و ذلک فی ذات اللہ و ان یشاء یشاء علی اوصال شلو ممزج

ترجمہ: ”مسلمان ہونے کی حالت میں مجھے جس کروٹ بھی مارا جائے، اس کی قطعاً پرواہ نہیں، کیونکہ مجھے خدا کی طرف لٹ کر جانا ہے اور یہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے کہ اگر وہ چاہے تو ان پانگڑہ کھڑوں کے بلا دینے پر ان میں برکت فرما دے“

مشہور صحابی حضرت حبیبؓ کو جب کفار کہ پچاسی دینے لگے، تو آپ نے ان اشعار کو نہایت جواہر دی سے پڑھتے ہوئے، راہ خدا میں جان دے کر خلعت شہادت کی سرفرازی کو حاصل کر لیا تھا اور آپ کی خبر شہادت اور سلام شوق کو خود حضرت جبریل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک مدینہ منورہ میں پہنچایا تھا۔

مولانا یحییٰ علی صاحب حضرت سید احمد شہیدؒ کے فراق میں یہ شعر بھی بڑے درد اور عشق سے اکثر پڑھا کرتے تھے۔

اتنا پیغام درد کا کنا، جب صبا کو نے یار سے گزرے
کون سی رات آپ آئیں گے دن بہت انتظار میں گزرے

مقدمہ کی پیروی | کچھ عرصہ کے بعد اپریل کے آخر میں یہ مقدمہ باجلاس میجر ایڈورڈز محلہ سیشن میں پیش ہوا اور ایک ہفتہ تک رو بکاری ہوتی رہی۔ محمد شفیع اور عبد الکریم کی طرف سے مسٹر گڈال بیرسٹر محلہ محسبڑی میں وکیل اور پروکار تھے۔ جب یہ مقدمہ کچری سیشن میں پیش ہوا تو مولوی محمد حسن اور مولوی مبارک علی صاحب نے جو پٹنہ والوں کی طرف سے پروکار تھے، مسٹر پلاؤڈن نائی ایک دوسرے وکیل کو بلا دیا۔ یہ وکیل بڑا جہاں دیدہ اور فہیدہ آدمی تھا۔ جب پلاؤڈن اپنا مختار نامہ لے کر، سوالات میں ہمارے دستخط کرائے آیا، تو مولانا عبد الرحیم صاحب، مولانا کئی علی صاحب، الٹی بخش سوداگر، حسینی، قاضی میاں جان، عبد الغفار اور منشی عبد الغفور صاحب نے تو اس پر دستخط کر دیئے، مگر میں نے نہ کیے اور کہا کہ میں وکیل ہوں، اپنی جواب دہی آپ کروں گا۔

مولانا کئی علی صاحب وکیل کی تقرری اور روپیہ کی بربادی سے راضی نہ تھے بلکہ اگر دوسرے لوگ آپ کو نہ روکتے تو آپ اپنے نیک اعمال کا اقبال کرنے کو تیار تھے لیکن آپ کی طبیعت اس قدر سیدھی سادی اور بے عذر تھی کہ جب آپ سے مختار نامہ پر دستخط کرنے کے لیے کہا گیا تو اس پر دستخط کر دیئے۔

حکومت کی طرف سے میجر وکیل اور پارسن پروکار اور وکیل تھے اور دس مدعا علیہم کی طرف سے دو وکیل تھے اور میں بذات خود اپنی جواب دہی کرتا تھا۔ جب کوئی گواہ پیش نہیں ہوتا تو اس کا جواب سیشن جج خود کہتے اور اس پر جرح کرتے۔ اس کے بعد سرکاری وکیل پھر مدعا علیہم کے دونوں وکلاء اور آخر میں یہ خاکسار جرح کے سوالات کرتا چونکہ میں سب سے زیادہ اس مقدمہ سے واقف تھا، گواہوں کے سوالات اور ریاست سے بھی بخوبی آگاہ تھا اور فن و کلام میں بھی پورا پورا تجربہ رکھتا تھا اور پھر اس وقت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے

دوسروں کی نسبت مجھے جرح کے ایسے ایسے سوالات سنبھلتے کہ اکثر گواہ میرے سوالات کے جواب سے تنگ آکر دوہائی دوہائی کرنے لگتے تھے۔

باجلاس عام ہونے کی وجہ سے بہت سے یورپین اور علی تاشا بن حاضر ہو کر یہ تماشہ دیکھ کر تے تھے۔ پارا سیر دو ہندو، دو مسلمان رؤسا ضلع انبالہ سے بلائے گئے تھے۔ جب شہادت طرفین تمام ہو گئی تو مدعا علیہم کے جواب ایسے گئے۔ دس مجرموں کا جواب تو ان کے وکیلوں نے تحریری داخل کیا۔ آخر میں جب سیشن جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ”بتاؤ تمہارا کیا جواب ہے؟“ تو میں نے حکومت کے ہر ایک ثبوت کی تردید کر کے اپنا جواب نہایت مشروح اور مدلل لکھنا شروع کیا۔ جج صاحب نے کچھ تو لکھا اور پھر بڑے غصے سے کہا کہ اس جواب کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم اپنے قصور کا اقبال کرو اور عدالت سے مہربانی اور رحم کی اپیل کر کے معافی مانگو۔ میں یہ مخالفہ تعلیم کا سبق سن کر چپ ہو رہا اور کہا کہ میں فقط انصاف چاہتا ہوں، جس کی آپ سے کوئی امید نظر نہیں آتی۔ میں نے اپنی بریت کے لیے دس بارہ گواہ بلا لئے چاہے لیکن اس کی بھی اجازت نہ ملی بلکہ ۲ مئی ۱۸۶۳ء کو جب عدالت کا آخری فیصلہ سنایا جانا تھا، اپنے گواہوں کو خود حاضر کرادیا لیکن انہیں بھی اظہار خیال کا موقع نہ دیا گیا۔

محمد شفیع اور اکثر دوسرے مدعا علیہم کی طرف سے بھی بہت سے گواہ پیش ہوئے لیکن بے سہو بلکہ محمد شفیع کی طرف سے تو حکومت کی خبر خواہی و خیر سگالی اور عمدہ کارگزاری کے ایک سو سے زیادہ سرٹیفکیٹ پیش ہوئے۔ لیکن اس متعصب جج نے ان سرٹیفکیٹوں کے متعلق یہ لکھا کہ ان کا ایک ایک فقرہ محمد شفیع کے مجرم اور سزا کے سخت کے مستحق ہونے پر ایک دلیل صالح اور برہان قاطع ہے۔

مسٹر پلاؤڈن کے قانونی نکات | مسٹر پلاؤڈن ہمارے لائی اور ویرینڈ وکیل تھے، انہوں نے بہت سی قانونی کتابوں اور نظائر سے ثابت کر کے یہ جواب لکھا تھا کہ سمعانہ وغیرہ — جہاں یہ جنگ ہوئی، جس

میں اعانت کا ان لوگوں پر الزام ہے۔ سرکار کی عہد داری سے باہر ہے۔ لہذا یہ جبرم دفعہ ۱۲۱ تعزیرات ہند کے تحت نہیں آتا۔ دفعہ ۱۲۱ صرف ان اقدامات جنگ پر لاگو ہوتی ہے۔ جو سرکاری علاقوں کے اندر عمل میں لائے جائیں۔ بھارت اور ملکا بہر حال بھارتی علاقے سے باہر اور آزاد علاقے ہیں۔ سیشن جج ہربرٹ ایڈورڈز نے یہ اعتراض مسترد کر دیا تو پلاؤڈن نے دوسرا اعتراض پیش کر دیا کہ میرے چھ موکوں (مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم حسینی، تھانیسی، حسینی عظیم آبادی، عبدالغفار اور الٹی بخش) میں سے پانچ کے خلاف مقدمہ اس عدالت میں نہیں چل سکتا کیونکہ انبالہ ڈویژن کی عدالتیں یقیناً گورنر پنجاب کے ماتحت ہیں اور میرے پانچ موکل عظیم آباد کے رہنے والے ہیں جو گورنر بنگال کے ماتحت ہے۔ منسلک فوجداری کی دفعہ ۲۶ اور ۲۷ کے مطابق جرائم کی تحقیقات یا تو ان اضلاع میں ہونی چاہیے جہاں ان کا ارتکاب ہوا، یا ان اضلاع میں جہاں ان کے نتائج برآمد ہوئے۔ دفعہ ۲۸ کے ماتحت شرکت اور اعانت کی صورت بھی یہی ہے۔

جب سیشن جج اور دوسرے انگریزوں نے وکیل کی یہ دلیل سنی تو کہتے میں رہ گئے اور سوائے ہال اور بجاکے ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ لیکن اس مقدمہ میں تو انگریزوں نے تعصب کی انتہا کر دی تھی اور مقدمہ کی کارروائی کے آغاز ہی سے قانون کو ہلائے طاق رکھ دیا تھا۔ مسٹر پوڈین کے اس قانونی نکتہ کا جواب دینے کے لیے باہم مشورہ کی غرض سے مقدمہ کو چند روز تک ملتوی کر دیا گیا اور گورنر جان لارنس اور دیگر ان افسروں سے مشورہ کیا گیا جو ہمارا قلع قمع ہی چاہتے تھے کیونکہ خود غرض لوگوں نے انہیں یہ سبق پڑھایا ہوا تھا کہ جب ان غریبوں کو پھانسی دے کر نیست و نابود نہ کر دو گئے، عہد داری سرکار ہند میں رہنا محال ہے۔ ان حالات میں قانون کو کون سنا ہے؟

فیصلہ بدت دراز تک التواء کے بعد ۱۲ مئی ۱۸۶۲ء کو سیشن جج نے آخری

اجلاس بلایا اور گورنر کے ایماء سے اپنی تجویز اور سزا گھر سے لے کر لایا۔ اجلاس کے ابتداء ہی میں سیشن جج نے پہلے چاروں افسروں سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ نے اس مقدمہ کو اول سے آخر تک سنا، اب آپ کی جوائے ہو کھ کر پیش کرو، ہم نے دیکھا کہ وہ چاروں افسر اس وقت بھی ہماری شکلوں کو دیکھ کر آنسو بھر بھر لاتے تھے اور دل سے ہماری رائی کے نواہاں تھے لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ جج اور کمشنر انہیں سزا دینے پر تلے ہوئے ہیں، تو ڈر کے مارا انہوں نے بھی یہ لکھ دیا کہ ہمارے نزدیک بھی ان پر جرم ثابت ہے۔

اس قانونی جیل کے حصول کے بعد جج اور کمشنر نے اپنی اس تجویز کو جو پہلے سے میز پر لکھی ہوئی رکھی تھی، پڑھنا شروع کیا اور آئیں بائیں شائیں کر کے مسٹر پوڈین کی دلیل کو مال دیا۔ سب سے پہلے میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ تم بہت عقل مند **سزا کا فیصلہ** ذی علم، قانون دان، اپنے شہر کے منبر دار اور رئیس ہو۔ تم نے اپنی ساری عقلندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا۔ تمہارے ذریعہ سے سرکار کے دشمنوں کو آدمی اور روپیہ جاتا تھا۔ تم نے انکار بحث سے کام لیا اور سرکار کی خیر خواہی کا قطعاً دم نہیں بھرا اور فحاشی کے باوجود تم نے قطعاً سرکار کی خیر خواہی نہ کی لہذا انہیں پھانسی دی جائے گی، تمہاری کل جائیداد بکن سرکار ضبط ہوگی، تمہاری لاشیں بھی وارثوں کو نہیں دی جائے گی بلکہ نہایت ذلت کے ساتھ جیل کے گورستان میں گاڑ دی جائے گی۔ آخر میں یہ بھی کہا کہ میں تمہیں پھانسی پر لگتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔

صاحب موصوف کا یہ سارا بیان میں نے نہایت سکوت سے سنا اور صرف آخری فقرہ کے جواب میں کہا کہ جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے، آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ رب العزت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کر دے لیکن اس جواب باصواب سے وہ بہت خفا ہوا۔ مگر پھانسی کا حکم دینے سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا؟ جس قدر سزائیں اس کے اختیار میں تھیں، دے چکا تھا۔ اس وقت میرے منہ سے یہ الٹا فقرہ نکلا کہ میں تو اس وقت

تک زندہ موجود ہوں مگر وہ اس حکم دینے کے تھوڑا عرصہ بعد انسانی موت سے راہی ملک م
ہو گیا۔ مجھے اپنی اس وقت کی کیفیت خوب یاد ہے کہ میں پھانسی کے حکم کو سن کر اتنا خوش
ہوا کہ شاید جنت اقلیم کی سلطنت ملنے پر بھی اس قدر مسرور ہوتا۔ اس حکم کے سننے سے میری
ترکیفیت ہوئی کہ گویا جنت الفردوس اور حوروں کا منظر آنکھوں کے سامنے ہے۔

میرے بعد مولانا یحییٰ علی صاحب، محمد شفیع اور پھر باری باری سب کو سزا کا حکم سنایا گیا۔
مجھے، مولانا یحییٰ علی صاحب اور حاجی محمد شفیع تین آدمیوں کو تو پھانسی حسب مذکورہ بالا اور
باقی آٹھ مجرموں کو حبس دوام بعینہ دریا کے شور مع صبلی کل جائیداد کی سزا ملی۔ میں نے مولانا
یحییٰ علی صاحب کو بھی نہایت بشاش پایا لیکن محمد شفیع کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا تاہم انہوں
نے بھی اپنی طبیعت کو بہت تھا۔ اس دن پولیس اور قاضی میں مرد و عورت بکثرت حاضر تھے
صل: نبالہ کی کچری کا نام امام غفلت سے بھرا ہوا تھا۔ جب جج حکم سن کر خاموش ہو آؤ کیا
پارسن کے زیر حکم پولیس کے صدر مسلح سپاہی میرے نزدیک آکر کھنے لگے کہ تمہیں تو پھانسی
کا حکم ملا ہے لہذا تمہیں تو رونا چاہیے لیکن تم بشاش بشاش ہو؟ میں نے جواب دیا میری
یہ بشاشت شہادت کی امید کی وجہ سے ہے، جو سب سے بڑی نعمت ہے۔ لیکن تمہیں کیا خبر
کہ کیا ہے راہ و رسم شاہ بازی؟

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پارسن، ایڈورڈز سے بھی بڑھ کر متعجب تھا اور اس
نے اس مقدمہ میں ابتداء ہی سے ہم پر بہت ظلم کیا تھا، جس کی تفصیل بیان کرنے سے قلم بھی
عاجز ہے مگر منقہ حقیقی خدا تعالیٰ تو موجود تھا، گو اس کے کام میں دیر ہو سکتی ہے۔ ہمیں سزا ہو
تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ یہ بے خوف بھی دنیا ہی میں پاگل ہو کر راہی ملک دم ہو گیا۔
اس دن قاضی بین لوگ ہماری پھانسی کا حکم سن کر زار زار رو رہے تھے۔ کوئی خدا
کی مرضی اور رضا بالقضا سے اپنے رنج کو روکتا تھا، کوئی دم بخود ساکت ہو کر ہمیں دیکھ رہا تھا
جیل خانہ تک، سڑک کے ارد گرد بیسیوں مرد و عورت ہمارا منہ دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ جیل خانہ

پہنچے تو ہم سب کو ریشہ لباس پہنا دیا گیا۔ ہم تین پھانسی والوں کو تو علیحدہ علیحدہ تین پھانسی گھڑوں
میں بند کر دیا گیا اور باقی آٹھ آدمیوں کو جیل میں دوسرے قیادوں کے ساتھ ملا دیا گیا۔

۱۲ مئی کی رات جب ہم جیل کی ان ٹنگ وٹاریک کوٹھڑیوں میں داخل ہوئے تو پچاسی
رات ہی جہنم کا ایک نمونہ مل گیا۔ صبح ہم نے اہالیان جیل خانہ سے اپنی یہ تکلیف بیان کی اور
چاہا کہ رات کو ہمیں ان کوٹھڑیوں سے باہر رکھا جائے مگر سبیل خانہ کے سب اہل ذمہ کے
مارے انکار کر کے باہر چلے گئے۔ جب یہ انکار کر کے جیل خانہ سے باہر نکلے اسی وقت ایک
سوار تار گھر سے ایک نروری لگاؤ لے کر پہنچا۔ کھن رجو ریا تھا تو اس میں یہی لکھا تھا کہ ان میں
پھانسی والوں کو بوقت شب باہر سلا یا کرو۔ تاہم انہی کا یہ طرفہ تماشہ دیکھ کر اسی دم جیل والوں نے
ہمیں یہ حکم سنایا کہ تمہارے لیے بڑے اہتمام سے تین ٹی پھانسیاں اور ان کے ریشی
رستے تیار ہوئے ہیں اور ادھر پھانسی کی منظوری کے لیے مقدمہ کی مسل کو پنجاب کے محکمہ
کورٹ میں بھیج دیا گیا۔

چیف کورٹ میں اسپیل

ہمارے دونوں وکیل بھی کچھ زائد محنت لے کر
مولانا محمد حسن صاحب، مولانا مبارک علی صاحب
براہم محمد سعید اور عبدالرحمن سپر محمد شفیع کے ہمراہ چیف کورٹ میں پہنچے اور میجر وکیل وغیرہ
سرکاری وکلاء اور پیر و مار بھی سب سے پہلے حاضر ہو گئے تھے اور ادھر جیل میں نقل حکم منٹاؤ
میں نے بھی خوب مدلل اسپیل لکھ کر سپرنٹنڈنٹ جیل کی معرفت چیف کورٹ روانہ کر دی۔
چیف کورٹ کے چند ابلا سوں میں بھی یہ مقدمہ بڑی دھوم دھام سے پیش ہوا اور وہاں
بھی ہمارے وکیل مشر پوٹن نے بڑے دلائل سے بار بار یہ کہا کہ یہ لوگ زیر دفعہ ۱۲۱ ہرگز
قید نہیں ہو سکتے۔ اس دفعہ کی رو سے انہیں قید کرنا سراسر خلاف قانون ہے، ان پر کوئی
دوسری دفعہ قائم کرو۔ اس زمانہ کے بوڈینشل کو شہر مسٹر رابرٹ کسٹ نے بھی وکیل کی
اس قانونی دلیل کو برسر اجلاس تسلیم کر لیا لیکن مشورہ کرنے کی غرض سے پھر چند روز تک التوا

کیا گیا۔ اسی اثنا میں اخبارات نے یہ خبر شائع کر دی کہ یہ لوگ رہا ہو چکے ہیں صرف مکمل سنا
باقی رہ گیا ہے۔ ہمارے گھر والوں کو تو ہماری رہائی کا اس قدر یقین ہو گیا کہ انہوں نے گھر سے
کپڑوں کا ایک نیا جوڑا بھی تیار کر کے بھیج دیا تاکہ رہائی کے دن اسے زیب تن کر کے گھر آؤں
لیکن چیف کورٹ کا الزام بہت لمبا ہو گیا۔ ہماری خلافت قانون قید پر غالباً انگلستان تک
سے رائے لی گئی۔

۲ مئی پھانسی کے حکم سنائے جانے کی تاریخ سے لے کر ۱۴ ستمبر تک ہم پھانسی گھروں
میں رہے۔ اٹلیان جیل ہمارے پھانسی دینے کا سامان تیار کر رہے تھے اور ادھر ہم انگریزوں کا
تماشہ بن رہے تھے۔ صدر صاحب لوگ اور ہمیں دیکھنے کے لیے روزانہ پھانسی گھروں میں
آتے تھے۔ دوسرے پھانسی والے عام قیدیوں کے برعکس جب یہ یورپین زائرین ہمیں نہایت
شاداں و فرحان دیکھتے تو اردو قصب اثر ہم سے پوچھتے کہ تمہیں تو بہت جلد پھانسی جوگی پھر تم اس
قدر خوشی کا اظہار کیوں کرتے ہو۔ ہم اس کے جواب میں صرف یہ کہتے تھے کہ ہمارے مذہب
میں خدا کی راہ میں ایسے ظلم سے مارے جانے پر شہادت کا درجہ ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس
پرست کا اظہار کرتے ہیں۔

خدا کی شان ملاحظہ فرمائیے کہ ہم پھانسی گھروں میں ہی تھے کہ بقرعہ آگئی۔ ہمیں خیال آیا
کہ آج مسلمان قربانی کا گوشت خوب اڑاتے ہوں گے۔ اللہ نے ہمارے لیے پھانسی گھروں
میں ہی عید کا سامان مہیا فرما دیا۔ وہ اس طرت کہ اس خیال کے تھوڑی دیر بعد ہی رات کے
وقت پلاؤ، قورمہ اور کباب وغیرہ بقرعہ کے سب کھانے ہمارے لیے ان پھانسی گھروں
میں غیب سے موجود ہو گئے۔ ہم نے خوب سیر ہو کر کھایا اور خدا تعالیٰ کا شکر بجالائے۔

ایک رات ہم قینوں آدمی پھانسی گھر میں ایک جگہ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ اس
وقت ہمارے سب محافظ باہمی مشورہ کے بعد ہم سے کہنے لگے کہ تم قینوں اس وقت اندھیری
رات میں بھاگ جاؤ۔ ہمیں غفلت کے جرم میں کچھ قید وغیرہ کی سزا ہو گی جسے ہم جھکت لیں گے لیکن

ہماری جانیں ترہنج جائیں گی۔ ہم نے ان کی ہمت اور نیت خیر کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ خداوند کریم
دونوں جہان میں تمہیں اس نیک نیتی کا اجر دے گا کہ ہم فرار نہیں ہوں گے۔ جب خدا چھڑا
دے گا، خود بخود چھوٹ جائیں گے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ بھائیو! جب اس کی مرضی نہ تھی تو میں
علی گڑھ سے پڑا گیا۔ اب دوبارہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔

رشتہ در گردنم انگسندہ دوست

سے بردہ ہر جا کہ خاطر خواہ دوست

پھانسی گھروں میں قید ہی تھے کہ قاضی میاں جان صاحب
قاضی میاں جان کا انتقال بیمار ہو گئے۔ آپ کو ہسپتال میں داخل کرا دیا
گیا لیکن اس کے باوجود آپ ہسپتال سے پھانسی گھروں میں ہماری ملاقات کے لیے اکثر
تشریف لایا کرتے تھے۔ وفات سے ایک دو روز قبل انہوں نے یہ خواب دیکھا کہ آسمان سے
ایک تخت جو ہر دار اتر رہا ہے اور ان کو اس پر بٹھا کر آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ گویا خواب
کی تعبیر یہ ہوئی کہ وہ تخت جنت الفردوس سے آیا تھا اور انہیں لے گیا۔ یہ بزرگ ہم سب لوگوں
سے عمر تھے مگر بایں ہمدردی صابر اور مستقل مزاج تھے۔ خداوند کریم انہیں جنت الفردوس نصیب
فرمائے۔ ہمارے ساتھیوں نے تجویز دیکھیں اور نماز جنازہ پڑھنے کے بعد گورستان بیل میں انہیں
سپرد خاک کرا دیا۔

انہی ایام کا ذکر ہے کہ تھانیسوس والدہ ماجدہ کو سانپ نے ڈس
آہ! والدہ مرحومہ لیا اور اس کے زہر سے ان کا انتقال ہو گیا۔ سنا ہے کہ آپ

بہت استقلال سے جاں بحق تسلیم ہوئیں۔ لوگوں نے جھاڑ پھونک کرنے والے مشرک لوگوں کو بلا
کر ان کی صحت کے لیے کچھ شرکیہ رسومات کرنا چاہا تھا مگر انہوں نے اس کی اجازت نہ دی
اور فرمایا کہ مدت ہوئی، مشرک و بدعت میرے گھر سے اٹھ گیا ہے۔ اب میں اپنے بیٹے کی غیر
حاضر میں اپنے گھر میں مشرک نہ ہونے دوں گی، ایسی بے ایمانی کی حیات سے موت افضل ہے

جب ان کے انتقال پر طلال کی خبر ہمیں پھانسی گھروں میں ملی تو اسی رات مولانا کچی علی صاحب نے مراقبہ میں دیکھا کہ وہ جنت میں بڑی شان و شوکت سے ایک تخت پر بیٹھی ہیں۔ پوچھا آپ کو یہ مرتبہ عالی کس سبب سے ملا؟ انہوں نے فرمایا کہ میرے بیٹے کے آلام و مصائب پر صبر کرنے کے باعث۔ میرے رب نے بخش دیا اور مجھے یہ درجہ عنایت فرمایا۔ اس وقت کی وفات بھی ایک امتحان پر امتحان تھا کہ جان، مال، آبرو اور مہر و نیکو کی پوری پوری آزمائش کی جائے۔

کالے پانی کی سزا مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا
کیا کمزور کیسے رہائی ہوتے ہوتے رو گئی!

محمد علی جوہر

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب ہم پھانسی گھروں میں قید تھے، انہی دنوں ایک مقبول بارگاہ الہی پر اللہ رب العزت نے یہ منکشف فرمادیا تھا کہ ہمیں پھانسی نہیں ہوگی بلکہ کالے پانی کو جانا ہوگا اور میں پھر وہاں سے باعزت زندہ سلامت آؤں گا؛ چنانچہ اس پیش گوئی کے دو ماہ بعد ہماری پھانسی کا حکم موقوف ہوا لیکن ہمیں پیش گوئی سننے ہی پر یقین ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسی وقت اپنے بھائی اور بعض دوستوں کو یہ خوشخبری لکھ دی تھی۔ اس وقت چونکہ تمام انگریزی سلطنت باغی ہمارے پھانسی دینے پر مستعد تھی اس وجہ سے شاید دوسرے لوگوں کو اس پیش گوئی کا یقین نہ ہوا ہو خصوصاً جب کہ صورت حال یہ تھی کہ اگر کوئی شخص ہمارے حق میں ذرا بھی کلمہ خیر کہتا تو قید ہو جاتا تھا۔ ہمارے شہر کے بیسیوں آدمی صرف اس قسم کے قصور میں قید ہو گئے کہ ان میں سے کسی کے پاس سے میرا کچھ مال و اسباب ملا یا میرے مکانات کی منبلی و نیلام کے بعد کسی نے اپنے گھر میں میرے بال بچوں کو جگہ دی۔ اس وقت اگر شاہ دوم بھی انگریزوں سے میری سفارش کرنا تو کبھی منظور نہ کرتے، ان حالات میں پھانسی کی موقوفی غیر ممکن اور بالکل بعید از قیاس تھی۔

اب اس مقابل القلوب کی ظاہری کارروائی سنئے کہ جب بہت سے صاحب اور ہم نہیں پھانسی گھروں میں نہایت شادان و فرماں دیکھ گئے تو سب لوگوں میں یہ چرچا پھیل گیا۔ ہمارے جانی دشمن انگریزوں نے یہ خیال کیا کہ ایسے دشمنوں کو مذہنی موت تو نہیں دینی چاہیے کہ جس پر وہ اس قدر مسرت کا اظہار کر رہے ہیں بلکہ انہیں کالے پانی بھیج کر وہاں کے آلام و مصائب کا تجربہ مشق بنانا چاہیے۔

ہماری پیش گوئی کے مطابق ۱۶ ستمبر کو ڈپٹی کمشنر انبالہ پھانسی گھروں میں تشریف لائے اور چیف کورٹ کا حکم پڑھ کر سنایا کہ تم لوگ پھانسی کی سزا کو بہت محبوب سمجھتے ہو اور اسے شہادت تصور کرتے ہو اس لیے حکومت تمہیں ہماری پسندیدہ سزا دینے کے لیے تیار نہیں لہذا تمہاری پھانسی کی یہ سزا جس دوام و عبور دریا کے شور سے بدلی جاتی ہے۔

اس حکم کے سننے کے ساتھ ہی ہمیں پھانسی گھروں سے دوسرے قیدیوں کے ساتھ عام بارکوں میں ملا دیا اور جیل خانہ کے دستور کے مطابق قیدیوں سے ہماری داڑھی، مونچھے اور سر کے بال وغیرہ تراش کر ایک منڈی بھیر کی طرح بنا دیا۔ میں نے اس وقت دیکھا کہ مولانا کچی علی صاحب اپنی داڑھی کے کترے ہوئے بالوں کو اٹھا کر کہتے تھے:-

”افسوس نہ کر، تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی کے واسطے کتری گئی۔“

لطیف

قدرت الہی کا ایک اور تماشہ بھی قابل ذکر ہے کہ میرے بھاری مجرم ہونے کی وجہ سے میرے لیے ریشمی رستہ اور پھانسی کا تجربہ خاص طور پر نہایت مضبوط تیار کر لیا گیا تھا مگر خدا کے حکم سے میری پھانسی تو موقوف ہوئی اور اسی اشارے میں خاص ولایت کے انگلش میں ایک گورے کو قتل کے جرم کی پاداش میں پھانسی کا حکم ملا اور پھانسی کا وہ سب سامان جو میرے لیے تیار کیا گیا تھا اس بے چارے ہم قوم یورپین کو نصیب ہوا۔

پادکن را چاد در پیش

جو تہ میرے گھر میں ڈالنے کے لیے انگریزوں نے بڑے اہتمام سے تیار کیا تھا اس قادیان
مطلقاً متعلقہ انقلاب نے ان کے ایک بھائی کے گھر میں ڈال دیا اور مجھے عاتق صاف
بچالیا۔ اس عجیب و غریب واقعہ کو ان اسرار و آیات الہی سے تصور کرتے تھے۔ اسی وجہ
سے اس گورے کی پھانسی کے بعد لوگوں نے اس رستے کے ٹکڑے بھی تبرکاً تقسیم کر دیے تھے۔

پھانسی کی موقوفی کے حکم سننے کے بعد دوسرے روز
دیگر قیدیوں کے ساتھ ہمیں بھی مشقت کے لیے بھیجا

..... جیل کی مشقت بھی

گیا۔ بنی بخش داروغہ جیل، رحیم بخش نائب داروغہ اور دوسرے سب دسی انفرگو ہمارے غایت
فرما تھے لیکن پرنٹنڈنٹ جیل کے خوف کی وجہ سے ہم تینوں آدمیوں کو کاغذ کوٹنے کی ڈھینکلی کے
کام میں لگا دیا جو اس جیل میں سب سے زیادہ سخت کام تھا۔ تھوڑی دیر تک ہم نے اس کو
پاؤں سے ہلایا تو پاؤں شل ہو گئے مگر اسی وقت ڈاکٹر بین عرف ریو پرنٹنڈنٹ، جیل کے کاغذ
گھر میں آئے اور ہمیں ڈھینکلی کے سخت کام میں دیکھا تو داروغہ پر بہت خفا ہوئے اور ہمیں
اس سخت کام سے نکال کر محمد شفیع اور مولانا یحییٰ علی صاحب کو تو سوت کھولنے کے کام میں
لگا دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر ایک ناؤ کے پاس لے گئے، جس میں کاغذ پھاڑ کر بھگوانے جاتے تھے
اور مجھے کہا کہ یہ دفتر کی ردی ہے غالباً ہمارے ہاتھ کے لکھے ہوئے کاغذ بھی اس میں ضرور ہوں
گے۔ تم اپنا دل بھلانے کے لیے ان کاغذات کو پڑھتے بھی رہو اور ردی کو پھاڑ پھاڑ کر اس
ناؤ میں ڈالتے بھی جاؤ۔ اللہ کے فضل سے میری مشقت دل لگی اور تعزیر طبع سے غالی نہ تھی اور
دوسرے ساتھی بھی کسی سخت کام میں نہ تھے۔ ہم دن بھر کام کرنے کے بعد رات کو سب کے
سب ایک جگہ بارک میں جا کر سو رہتے۔

جب ہم جیل گئے تو قیدیوں کو صرف روٹی، دال اور بنفٹے میں دو یا تین دن تیل میں بھکاری
ہوئی ترکاری ملا کرتی تھی۔ گھی، گوشت یا دودھ وہی ابتدائے عملداری سرکار سے کبھی کسی قیدی نے
خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔ تاہم الہی ہمارے شامل حال ہوئی کہ جوں ہی ہم جیل میں داخل ہوئے،

انپکٹر جنرل مجلس پنجاب کے حکم سے پنجاب کے تمام قیدیوں کو عمدہ گوشت، گھی اور دہی ملنے
لگی۔ ان غیر مترقبہ نعمتوں کو دیکھ کر سب قیدی ہیں دعائیں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ سب تمہارے
وجود مسعود کی برکت کا نتیجہ ہے۔ طرفہ یہ کہ جب تک ہم لوگ جیل خانے پنجاب میں رہے، تب
تک یہ چیزیں سب جیل خانوں میں برابر ملتی رہیں مگر ہمارے کالے پانی کو روانہ ہونے کے
ساتھ ہی ایک قلم بند ہو گئیں بلکہ ہمارے جانے کے بعد بے چارے قیدیوں کو گندم کی روٹی کے
بجائے جو ارباب سے کی روٹیاں ملنے لگیں۔

ہم انبار جیل ہی میں تھے کہ قیدیوں میں دبائی بخار اور سرسام بڑے زور
شور سے پھیل گیا۔ کوئی چوتھے تھتھ کے قریب قیدی اس مرض سے
فوت ہو گئے۔ کیفیت یہ تھی کہ بخار ہو جاتا اور کچھ دیر بعد مرین پل بتا۔ سینے دو سینے کی میما
والے بہت سے قیدی مر گئے۔ جیل کے باہر خیمے لگائے گئے اور قیدیوں کو ان میں منتقل کر
دیا گیا مگر حضرت بخار نے وہاں بھی چھپا نہ چھوڑا۔

خاکسار بھی اس دبائی مرض سے نہ بچا اور سخت بیمار ہو گیا۔ مجھے جیل کے ہسپتال میں
داخل کر دیا گیا اور ڈاکٹر بشن صاحب دلی توجہ سے میرا علاج کرنے لگے لیکن بخار سے قطعاً آفاقہ
نہ ہوا گو سرسام کی نوبت نہ پہنچی تھی مگر میں کئی دن تک بے ہوش پڑا اور کمانے پینے کی کسی
چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ انگریزی دوائیں مجھ پر ذرہ بھر اثر نہیں کر رہی تھیں۔ لاچار ہو کر ڈاکٹر
صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ اس مرض کے لیے تم گھر پر کیا دوا کھاتے تھے؟ میں نے کہ
ہندوستانی دوائیں کھاتا تھا، انگریزی دوائی بھی استعمال نہیں کی شاید یہی وجہ ہے کہ ان دواؤں
سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے۔ انہوں نے کہا تمہیں ان دواؤں کے نام معلوم ہیں؟
میں نے اثبات میں جواب دیا۔ انہوں نے کہا اچھا ان دواؤں کے نام ایک کاغذ پر لکھ دو
ہم تمہیں بازار سے منگوا دیں گے۔ میں نے مرتبہ سبب، مرتبہ ہی، شربت انار، شربت بنفشہ،
شربت نیلوفر اور ورق نقرہ وغیرہ عمدہ عمدہ منسے دار و مفرج ادویہ ایک کاغذ پر لکھ دیں اور

انہوں نے اسی وقت وہ سب بازار سے منگوا کر میرے حوالہ کر دیں۔

بیماری کی وجہ سے زبان کا مزہ تو بگڑا ہوا ہی تھا، میں نے ان کو جب یکے بعد دیگرے کھایا تو بہت مزہ آیا۔ بخار چونکہ تپ حرقت کی قسم سے تھا، اس لیے شربتوں کے استعمال سے دوسرے دن ہی اتر گیا۔ مزہ جات اور ادراقی نعرہ کے استعمال سے بدن اور معدہ میں بھی قوت پیدا ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے جب دوسرے دن مجھے تندرست دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور نقاہت دور کرنے کے لیے شوربا گوشت اور دودھ مقرر کر دیا۔

دنیا کی دولت اور چشم و جاہ کی ناپائیداری، حالت سیلابی اور ہرجائی کا اندازہ لگاتے کر خانہ تلاشی سے قبل ۱۲ دسمبر تک میرے پاس ہزاروں روپیہ کی جائیداد منقولہ تھی، بیسیوں آدمی میری رعیت میں تھے، ایک بڑے شہر کا مہر دار تھا، گھوڑے اور گاڑیاں ساری کے لیے تھیں اور ہر کام کے لیے گھوڑیں نوکر چاکر تھے لیکن خانہ تلاشی کے چند گھنٹے بعد جب میں فرار ہوا تو سب جاہ و چشم خاک میں مل گیا۔ میرے فرار یا شدید غصہ کی وجہ سے مقدمہ کے اختتام پر صادر ہونے والے حکم سے قبل ہی انگریزوں نے پچھلے دن تمام جائیداد قرق کر لی تھی۔ دوسرے دن میرے عزیزوں کو کوئی اپنے برآمدہ میں بھی کھڑا نہ ہونے دیتا تھا الغرض ایک ہی رات میں کایا پلٹ گئی۔ کل جس مال و دولت کا میں مالک تھا، آج وہ دوسروں کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔

میرے وارثوں کو اس قدر موقع بھی نہ ملا کہ وہ قرقی سے قبل جائیداد کا کوئی حصہ علیحدہ کر سکیں فیصلی کا حکم صادر ہونے کے بعد، میرے بھائی نے جب اپنے حصے کا دعویٰ کیا، تو اسے صرف ایک کوٹھڑی دی گئی اور باقی سب منقولہ و غیر منقولہ جائیداد مجھے سونپ کر ضبط کر کے سیلام کر دی گئی۔ میں نے دوران میں نیال کرتے ہوئے، اس حادثہ سے ساتھ برس قبل اپنے حصہ کی کل جائیداد کو اپنی بیوی کے سر میں موقوف کر کے ایک شرعی بیع نامہ لکھ دیا تھا، اب وہ بیع نامہ بھی پیش کیا گیا مگر انگریزوں کو اس قدر شدید غصہ اور تعصب تھا کہ

انہوں نے ایک نشئی اور میری بیوی اور دو شیر خوار بچوں کے ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا۔ بھانسی کے حکم کی تبدیلی کے بعد ہم ستمبر ۱۸۶۳ء سے فروری ۱۸۶۵ء تک انبالہ جیل رہے۔ محمد شفیع کے گھر سے اکثر عمدہ عمدہ کھانا آیا کرتا تھا۔ ہم اسے جیل میں ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر بڑے مزے سے کھایا کرتے اور شکر الہی بجا لیا کرتے تھے۔ یہاں تک اپنی تعریف کھتے کھتے میرا نفس بہت پھول گیا ہے اور اکثر مقامات پر اپنی تعریف میں مبالغہ کرنا چاہتا ہے لہذا اپنے نفس کے دو عیب بھی یہاں تحریر کرتا ہوں تاکہ اس خود پسند موزی کو ذرا ذلت ہو اور پھر مجھے مبالغہ کی ترغیب نہ دے۔

صاف صاف باتیں

ان دو عیوب میں سے ایک تو یہ ہے کہ جب ہم ایک مقفل بارک میں سویا کرتے تھے۔ ان دنوں کی بات ہے کہ ایک سپاہی محمد شفیع کے گھر سے پلاؤ لے کر آیا، تو ایک جنگل کی طرف سے پلاؤ لینے کے لیے چلا گیا۔ پلاؤ دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ ایک بڑی سی بوٹی اٹھا کر منہ میں ڈال لی اور تھوڑا سا چبا کر اسے جھٹ پٹ نکل لینا چاہا، لیکن مال مسروقہ صلت سے نیچے کیسے اترتا؟ بوٹی صلت میں خس گئی، نیچے جاتی تھی نہ اوپر آتی تھی، میرا دم گھٹنے لگا اور میں رٹھ کر گر پڑا۔ میرا گلا ٹوٹ گیا تو وہ بوٹی باہر نکل آئی اور میرے نفس کا یہ عیب سب ساتھیوں کے سامنے ظاہر ہو گیا۔ اگرچہ محمد شفیع کے ساتھ معاملہ ٹھیک تھا اور ان کی طرف سے ہمیں ہر طرح کی اجازت تھی لیکن پھر بھی یہ حرکت طفلانہ اور نہایت نازیبا تھی لہذا میں نے مال مشتبہ کے صلت سے نیچے اترنے پر شکر الہی ادا کیا۔

اس سے بھی بڑھ کر اپنے نفس کی شرارت کا ایک اور واقعہ عرض کرتا ہوں۔ ہمارے جیل کے ایک ساتھی منشی عبدالغفور خاں بھی تھے جو کہ ہمارے ساتھ انبالہ جیل میں تھے۔ میرے بھائی کے نام ان کے گھر سے دس روپے کا سنی آرڈر آیا۔ بھائی صاحب دس روپے کا نوٹ لے کر جب میرے پاس آئے تو انہیں بھی رقم کی شدید ضرورت تھی۔ میں نے منشی عبدالغفور خاں کو اطلاع کیے بغیر وہ نوٹ اپنے بھائی کو دے دیا اور انہوں نے اپنے کام میں اسے خرچ کر لیا

منشی عبدالغفور خاں کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے میری کوئی شکایت نہ کی کیونکہ وہ برسوں سے گھر رہے تھے۔ اور مجھے اپنا بزرگ سمجھتے تھے اور میں نے جرات بھی اسی بھروسے پر کی تھی تاہم دوسرے لوگوں نے مجھے ضرور لعن طعن کیا۔ اس وقت میرے پاس اتنی گنجائش بھی نہ تھی کہ انہیں دس روپے دے سکتا۔ پورٹ ٹیر پہنچنے کے بعد میرے ہاتھ میں روپیہ آیا تو میں نے انہیں لاہور جیل میں بھیج دیا۔

اپنے نفس کے ان دو عیوب کے اظہار کے بعد میں اللہ رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے معاف فرمادے اور میری ان حشر میں نیکوں کے سامنے ذلیل نہ کرے۔

مولانا احمد اللہ کی گرفتاری | جن دنوں ہم نے چیف کورٹ پنجاب میں اپیل دائر کر رکھی تھی، ہمارے وکیل سٹر پیوڈن نے یہ خبر دی کہ اگر تم اپیل کر کے چیف کورٹ پنجاب سے رہا نہ ہوئے تو انگریزوں کا ارادہ ہے کہ وہ مولانا احمد اللہ صاحب کو بھی گرفتار کر لیں گے؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب ہماری اپیل مسترد کر دی گئی تو انگریزوں نے سکھلا پڑھا کر ہمیں مولانا احمد اللہ کے خلاف جھوٹے گواہ بنانے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

تحصیلدار میر محبوب الدین ساکن نارنول، جو رشوت ستانی کے قصور میں انبالہ جیل میں

مولانا احمد اللہ بن مولانا انٹی بخش کی ۱۲۲۳ھ میں ولادت باسعادت ہوئی۔ آپ کا اسم گرامی احمد بخش تھا جسے حضرت سید احمد شہیدؒ نے احمد اللہ سے بدل دیا تھا۔ مولانا ولایت علیؒ اور مولانا منور علیؒ آردی سے کسب فیض کیا۔ آپ کی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد انگریز بہادر نے ضبط کر کے کوڑیوں کے مول نیلام کر دی تھی، اہل دیوال کو عین عید کے دن بے خانمان کر دیا گیا تھا۔ اسی داستانِ خونچکاں کو آپ کے صاحبزادے مولانا حکیم عبدالحمیدؒ (۱۳۲۳ھ) نے مثنوی شہر آشوب کے نام سے نظم کیا تھا۔ مولانا احمد اللہ صاحب کو بھی جس دوام بعبور و ریجا شور کی منزل ہوئی تھی۔

قید تھا۔ انگریزوں نے اس سے وعدہ کیا کہ اگر تم ان گیارہ آدمیوں میں سے کسی کو مولانا احمد اللہ کے خلاف گواہ بنا دو تو تمہارا قصور معاف کر کے تمہیں دوبارہ تحصیلدار بنا دیا جائے گا؛ چنانچہ اس نے اپنی ذیوی بھلائی کے لیے کارروائی شروع کر دی۔ ہمیں جب اس کا علم ہوا تو ہم نے اپنے ساتھیوں کو سمجھایا کہ بھائیو! ہماری دنیا تو خراب ہو گئی ہے اب فقط دین باقی رہ گیا ہے۔ خدا بھونے گواہ بن کر اسے نہ جھاڑو۔ کہیں ہماری مثال بھی وہ نہ ہو جائے کہ طع

دونوں طرف سے گئے ہاتھ نے اڑھار ملوانہ اڑھار ملوانہ

اس کی دن بھر کی ترفیب سے جس قدر اثر ہوتا رہا ہماری تھوڑی سی نصیحت سے زائل ہو جاتا تھا۔ اس لیے اس نے انگریزوں سے کہہ دیا کہ جب تک اس جیل میں محمد جعفر اور مولانا یحییٰ علی صاحب موجود ہیں، کوئی گواہ نہیں بن سکتا؛ چنانچہ مجھے مولانا صاحب اور میاں عبدالغفار کو سنٹرل جیل لاہور روانہ کر دیا گیا اور محمد شفیع، عبدالکریم، الٹی بخش اور منشی عبدالغفور وغیرہ کو انبالہ جیل ہی میں رہنے دیا۔ ہمارا اس جیل سے روانہ ہونا ہی تھا کہ محمد شفیع اور عبدالکریم وغیرہ سرکاری گواہ بن گئے اور ان کی جھوٹی شہادت کی وجہ سے وقت کے ولی اللہ، شمس الاسلام حضرت مولانا احمد اللہ صاحب کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی اور مئی ۱۸۶۵ء میں انہیں جس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی؛ چنانچہ آپ جون میں ہم سے بھی پہلے انڈمان تشریف لے گئے۔

یہاں یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ پہلے محمد شفیع کو کس قدر شدید غصہ کے ساتھ پھانسی کا حکم دے کر اس کی پچاس لاکھ کی جائیداد ضبط کی اور پھر صرف ایک برس بعد گواہی کا حیلہ کر کے اسے رہا کر دیا تاکہ ضبط شدہ جائیداد واپس نہ دینی پڑے۔ اگر وہ بے چارہ بے قصور تھا جیسا کہ ایک

آپ نے بھی مسلسل اٹھارہ برس جزائر انڈمان میں غریبی و اسیری میں گزارے۔ ملاحظہ فرمائیے تذکرہ صادقہ ص ۴۲، ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۱۰۷، ۱۱۴، ۱۵۱، سرگزشت مجاہدینی ص ۲۲، ۲۳، ۲۴، ہندوستان میں اہل غریب ص ۷۵-۲۸۰۔ آپ نے ۱۸۶۵ء کو انڈمان میں قید و رنج فرمایا

سال بعد کی رہائی سے معلوم ہوتا ہے، تو بڑے شہر کے ساتھ اس کی جائیداد کی منبلی اور پچاسی کی سزا کیوں تھی؟ اور اگر وہ بہت بڑا مجرم تھا، جیسا کہ سیشن جج نے اپنے فیصلہ میں مندرجہ ذیل سے ثابت کیا تو ایک سال کے بعد رہائی کیوں؟

اس کے بعد ۱۸۸۷ء تک امیر خاں صاحب سوداگر چرم، مولوی تبارک علی صاحب مولوی امیر الدین صاحب ساکن پٹنہ، بنگال اور ابراہیم منڈل ساکن اسلام پور وغیرہ دہلیوں کی گرفتاری کے جس قدر مقدمات پیش ہوئے، ان سب میں ان سرکاری گواہوں کو جھوٹی گواہی دینے کے لیے بلایا جاتا تھا اور میں نے خود ان گواہوں میں سے ایک کی زبانی سنا تھا کہ جب کبھی ہم جھوٹی گواہی دینے سے انکار کرتے ہیں تو ہمیں کہا جاتا ہے کہ تمہیں تو مشروط طور پر صرف اسی لیے رہا کیا گیا تھا کہ تم بوقت ضرورت گواہی دے سکو۔ یاد رکھو اگر تم نے گواہی دینے سے انکار کیا تو تمہیں پہلے وارنٹ پر ہی جس دواہ کی سزا دے کر کالا پانی بھیج دیا جائے گا۔

انبالہ جیل سے لاہور جانے کے لیے جب میں تیار ہوا، تو بیوی بچے ملاقات کے لیے جیل میں آئے۔ جس دن ملاقات ہوئی رمضان المبارک کا مہینہ اور میں روزے سے تھا۔ جیل سے باہر ایک کوٹھڑی میں بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ میرا گرو رنگ کا لباس، قبل کارٹر اور پاؤں پابند زنجیر و سلاسل دیکھ کر میرے یہ اقربا نہایت غلین و افسردہ ہوئے۔ میں نے انہیں تسلی دی اور ہر حال میں دامن ایمان و صبر، مضبوطی سے تھامے رکھنے کی تلقین کی۔ کوئی سال سو سال کے بعد آج جب میں نے اپنے بیٹے محمد صادق کو دیکھا، تو وہ ایسا صحت مند تھا کہ میں اسے مشکل سے پہچان سکا۔ اس سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد میں نے اسے دوبارہ اس دنیا میں نہیں دیکھا۔

۲۲ فروری ۱۸۹۶ء کو ہم لاہور جیل کی طرف روانہ ہوئے جو گیارہ گرو والباس زیب تن، کالا کپڑا اوڑھے ہوئے بٹری و تھکڑی کے زین پر سے آراستہ و پیراستہ منزل در منزل اور کوچ در کوچ یہ قافلہ شاق

سوئے منزل رواں دواں تھا۔ چالیس چالیس قیدیوں پر مشتمل یہ قافلہ تھا۔ ایک دو گاڑیاں بھی ساتھ تھیں۔ سب پیدل چل رہے تھے البتہ کوئی تھک جاتا تو است گاڑی پر سوار کر لیا جاتا اور نہ سب کے سب پاپادہ ٹھال چمن چھپاتے عجیب شان بے نیازی سے چلے جاتے تھے۔ برس برس کے بعد جو باہر کی جو اکائی تو طبیعت نہایت خوش ہوئی، راستے میں جو چاہتے خرید کر کھاتے جاتے تھے۔ سفر میں سب سے بڑی نعمت مولانا یحییٰ علی صاحب کی معاجبت تھی، جس کے باعث سفر میں بھی دن عید اور رات شب برات ہو گئی تھی۔

قدرت کی کرشمہ سازیاں ملائم فرمائیے کہ جس دن ہم نیا گرو والباس پہن کر منزل اقل سے روانہ ہوئے، مہاراجہ ہندروالی پٹیل کی بات اسی راستے سے عین ہمارے سامنے سے گزرتے ہوئے، بڑی دھوم دھام کے ساتھ جنوب سے شمال کو جا رہی تھی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا، صبح کا سنا وقت تھا اور فردری کے آخر کے گلابی جازے تھے۔ ایک طرف سوچ کی کرنوں میں برات کے سونا چاندی، تاش بادلہ اور ہیرہ مرصع کی چمک، دوسری طرف ہماری لمبے کی بٹری اور تھکڑی کی دمک، اُدھر و شالوں اور کزواب و بانات کا رنگ، اُدھر ہمارے جو گیارہ والباس کی سُرنی اور سیاہی کا ڈھنگ، اُدھر ہاتھی اور گھوڑوں کی ہنکار، اُدھر ہماری بٹریوں اور تھکڑیوں کی ہنکار ایک دوسرے کے مقابل، اس دنیا فانی کی عزت و ذلت اور عارض و دائم کی کمی بیشی کا فرق عجیب خوبی سے دکھلا رہی تھی۔ لیکن بے اس وقت اس راجہ نے ہمیں بڑی چشم حقارت سے دیکھا ہو لیکن میری ہندوستان واپسی سے بہت برس قبل وہ راہی ملک بھاہر گیا وہ ملک بھاہر کی طرف امیر و فقیر دونوں اسی طرح خالی ہاتھ جاتے تھے، جس طرح اس دار فناء میں خالی ہاتھ آتے ہیں۔ افسوس کہ اس راجہ نے اس عروس دنیا سے بہت ہی کم فائدہ اٹھایا، جس کے لیے اس قدر دھوم دھام کا مظاہرہ کیا تھا۔

ہم جو ایک مدت دراز کے بعد جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں سے نکل کر باہر کھلی فضا میں پہنچے، تو ہمیں بھی مہاراجہ پٹیل کے براتیوں سے کم خوشی نہ ہوئی ہوگی۔ ہم ہرنوں کی طرح چوڑیاں

لاہور جیل کی طرف واپسی

بھرتے چلے جا رہے تھے۔ جن قیدیوں کے پاس کچھ نقدی تھی، وہ راستے میں جو چاہتے خرید کر کھاتے اور خوشی مناتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ہم لدھیانہ، پھلور، جالندھر اور امرتسر ہوتے ہوئے لاہور پہنچ گئے۔ آخری منزل لاہور تھی۔ جب شالامار باغ کے سامنے پہنچے تو ہر ایک نے اپنا اپنا من بھر کر جو چاہا سو کھایا کیونکہ جیل کی کال کوٹھڑیوں میں معمولی کھانے کے علاوہ اور چیزیں ملنی محال بلکہ جرم تھیں۔

تین سبے شام کے قریب ہم سینٹرل جیل لاہور کے دروازے پر پہنچے۔ دروازہ پر ہلکے چالان کے تمام قیدیوں کو ایک قطار میں بٹھا دیا گیا تھا۔ سب سے پہلے ایک کشمیری ہندو داروغہ آیا، جس نے ہم سب کو بغور دیکھا اور کسی قدر افسوس بھی کیا۔ پھر ڈاکٹر گرسے پرنٹنڈنٹ جیل آئے۔ اس نے بھی سب سے پہلے ہمارا ملاحظہ کیا اور پھر بڑے فحشے سے حکم دیا کہ ان کے پاؤں میں ایک آڑا ڈنڈا بھی ڈال دینا چاہیے؛ چنانچہ اس حکم کے صلہ ہونے کے ساتھ ہی دوبار آہنی ڈنڈے لے کر حاضر ہو گئے اور ہمارے دونوں پاؤں کے دونوں کھڑوں کے درمیان ایک فٹ پانچ گز لمبا آڑا ڈنڈا ڈال دیا گیا۔ ازراہ تعصب یہ ڈنڈا امرتسار سے لیے ہی تھا ورنہ جیل میں ہم نے اور کسی قیدی کے پاؤں میں نہیں دیکھا۔ اس ڈنڈے کی وجہ سے چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا نہایت مشکل ہو گیا اور رات کو پاؤں سپا کر سونا بھی نہایت محال تھا۔

اس جیل کے درمیان میں ایک برج تھا اور اس کے ارد گرد آٹھ علیحدہ علیحدہ بارکیں، صحن اور کارخانہ مشقت بنا ہوا تھا۔ پرنٹنڈنٹ نے حکم دیا کہ اس مقدمہ میں قوت تمام قیدیوں کو علیحدہ علیحدہ بارکوں یا فبروں میں رکھو تاکہ یہ ایک دوسرے سے ملنے نہ پائیں۔ اس دن دوستوں سے جدا ہونے کی اذیت، آہنی ڈنڈے سے بھی بڑھ کر محسوس ہوئی۔ مجھے ان بارکوں میں سب سے زیادہ سخت فبر اول میں لے گئے لیکن تاہم غیبی سے ۶ سبے شام یہ حکم پہنچا کہ یہ قیدی انبالہ کے بیماری والے ہیل سے آئے ہیں لہذا انہیں دوسرے قیدیوں سے علیحدہ رکھا جائے، تاکہ بیماری اس

جیل میں نہ پھیلے۔

اس حکم کے بعد بارک نمبر ایک کو، جہاں مجھے رکھا گیا تھا، میرے تمام ساتھیوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ ہم سب دوستوں کے اس اجتماع پر بہت خوش ہوئے اور حکمت الہی اور اس کے اسرارِ نہاں پر سجدہٴ تشکر بجالائے۔ اس بارک کا جمعہ وار چونکہ ایک مسلمان تھا لہذا ہمیں کارخانہ مشقت میں بھی کسی کام پر نہ لگایا گیا بلکہ اللہ کا فضل شامل حال ہوا اور پرنٹنڈنٹ نے خود مجھے اس فبر کا منشی مقرر کر دیا مگر وہ ڈنڈا جو غالباً کسی بڑے حاکم کے حکم سے تھا بدستور زیب پارا۔ جب ہر روز صبح کے وقت پرنٹنڈنٹ صاحب آتے اور مجھے ہر قیدی کی مشقت کا حساب دکھانا پڑتا تو مجھے ہرن کی طرح اچھل اچھل کر ان کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ اتوار کے دن میں اپنے بستر پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک قیدی کا اعلیٰ کردار تھا کہ ایک چانک پرنٹنڈنٹ صاحب ہمارے فبر میں پہنچے اور تمام قیدیوں کی تلاشی کا حکم دیا۔ یکے بعد دیگرے سب کی تلاشی ہوئی۔ جب میرے بستر کی تلاشی ہوئی تو اس میں سے تھوڑا سا پیسا ہوا نمک برآمد ہوا اور یہ ایسا قصور تھا کہ اس کی پاداش میں کوٹھڑوں کی سزا ہو جایا کرتی تھی۔

جب یہ برآمد شدہ نمک پرنٹنڈنٹ کے سامنے پیش ہوا، تو میں حیران تھا کہ کیسے جواب دوں۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ مندل نامی ایک مسلمان قیدی جو انبالہ جیل سے میرے ساتھ آیا تھا اور میری خدمت کیا کرتا تھا، کہنے لگا کہ یہ بستر اور نمک تو میرا ہے، مولوی صاحب کا نہیں۔ پرنٹنڈنٹ نے پوچھا یہ کیسے؟ اس نے کہا کہ حضور کے تشریف لانے سے پہلے میں اور مولوی صاحب پیشاب کرنے کے لیے بیت الخلاء میں گئے تھے کہ اسی اثناء میں آپ آ گئے۔ ہم جلدی جلدی جو دوڑ کر آئے تو گھبراہٹ میں ایک دوسرے کے بستر پر بیٹھ گئے۔ پرنٹنڈنٹ یہ بیان سن کر بہت ہنسنا اور کہنے لگا کہ تم مولوی صاحب کو بچانا چاہتے ہو۔ اس کے بعد فبر سے باہر جہاں کوٹھے لگائے جاتے تھے ہم دونوں کو لے گیا۔ دوسرے

۱۰۰ دن کے بعد ہیں۔ قتل سے قریباً پانچ میل کے فاصلے پر دریائے سندھ کے کسی تین
 یلکھاٹ سے انجنوٹ میں سوار کیا گیا اور اس میں قطار در قطار بٹھا دیا گیا۔ بیٹری، ہتھکڑی اور
 توپیلے سے زیب تن تھے، یہاں ایک بڑی موٹی آہنی زنجیر بھی، ہماری بیڑیوں کے درمیان پھنسا
 دی گئی، جس کی وجہ سے اٹھنا بیٹھنا محال تھا۔ پاخانہ پیشاب بھی اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے کرتے
 رہے۔ اس وقت قریباً آدھا آدمی لوہا ہمارے جسم پر تھا۔ اگرچہ دریائے سندھ ہلکے
 زیر پاٹھا نہیں مار رہا تھا لیکن ہم اس قدر مجبور و بے بس تھے کہ دھوکہ کرنے کی بھی توفیق نہ تھی لہذا
 پڑے پڑے تیم سے نمازیں پڑھتے تھے۔ گوہر یہاں جکڑے پڑے تھے لیکن جیل سے نکل کر وہ جیل
 کی مساجد، آب وریاکی، دانی اور آس پاس کے جنگلوں کی سرسبزی و شادابی کو دیکھ
 کر نہایت خوش تھے۔

اسی کیفیت میں پانچ چھ روز کے بعد کوٹری پہنچ گئے۔ راستے میں سکھ، بکھر اور ٹھٹھے کے
 مشہور معروف قلعے بھی دریائے سندھ کے کنارے نظر آئے۔ کوٹری کے سامنے دریائے
 سندھ کے دوسرے کنارے، سندھ کا مشہور شہر حیدر آباد بھی دیکھنے میں آیا۔ اسی دن کوٹری سے
 بذریعہ ریل کراچی پہنچ گئے۔ کراچی میں منشی اور کلرک بڑی بڑی اونچی ٹوپیاں اور ہندو مناجن بڑی
 بڑی اونچی پکڑیاں پہنتے تھے۔

جب انبالہ جیل سے روانہ ہوئے تو خیال تھا کہ انگریزی عملداری میں ہر جگہ اردو یا فارسی
 کا دفتر ہوگا اور ہم منشی گری میں کمال کی وجہ سے محوری کے کام میں رہ کر قید میں آرام سے رہیں
 گے۔ یہ خیال بالکل اس قدر مسلط تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا مطلق خیال نہ رہا اور اس کا احساس
 اس وقت ہوا، جب یہ دیکھا کہ اردو اور فارسی کا دفتر تو ملتا ہی نہیں ہے۔

سندھ میں ہر جگہ دفتری زبان سندھی تھی۔ سندھی زبان کے حروف اگرچہ فارسی جیسے ہیں
 لیکن اس کے باوجود ہمارے لیے اس زبان کو سمجھنا نہایت دشوار تھا۔ گویا سندھ میں ہمارا
 شمار ناخواندہ لوگوں میں ہونے لگا اور وہ جو منشی گری کا غرور تھا یا غیر اللہ پر بھروسہ تھا، خود بخود ختم ہو گیا۔

جن قیدیوں کے بستروں سے کچھ نکلا تھا انہیں کوڑے لگنے شروع ہوئے، جب سب کو کوٹے
 لگ چکے تو پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر مندل سے پوچھنے لگا کہ کیا یہ سچ ہے کہ یہ ٹھک۔ اور بستر تیار
 ہے، مولوی صاحب کا نہیں؟ اس نے کہا جی ہاں! ٹھک اور بستر تو میرا ہے، آگے
 آپ کو اختیار ہے۔ یہ جواب سن کر اس نے ہم دونوں کو بری کر دیا اور کچھ سزا نہ دی اور مندل
 سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ اچھا اگر تم مولوی صاحب کو پچانا پاتے ہو تو ہم نے تم کو بھی
 معاف کر دیا۔ آئندہ محتاط رہنا۔

کراچی کو روانگی اکتوبر ۱۹۶۵ء کے آخری ایام تھے کہ قیدیوں کا ایک بڑا بھاری
 چالان کیا گیا اور انہیں ملتان روانہ کرنے کے لیے بندوبست کیا
 جانے لگا اور ایک ہتھکڑی دو دو قیدیوں کے ہاتھوں میں لگا دی گئی۔ برے ساختی نے مجھ سے
 یہ رعایت کی کہ میرا بایاں اور اپنا دایاں ہاتھ ہتھکڑی میں ڈلوایا۔

ہمارے مقدمہ کے فقط تین آدمی یعنی میں، مولانا کھٹی علی صاحب اور میاں عبدالغفار صاحب
 ملتان روانہ ہوئے۔ روانگی کے دن کیفیت یہ تھی کہ سنٹرل جیل سے لاہور دیوے اسٹیشن تک
 پاؤں میں بیڑی، سر پر بستر، جسے ایک ہاتھ سے تھامے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں ہتھکڑی
 کی گھورت، اس پر سپاہیوں کی ڈانٹ ڈپٹ مستزاد کہ جلدی کرو ورنہ ریل چھوٹ
 جائے گی۔ ہر کیفیت جب ہم اسٹیشن پر پہنچے تو ہمیں ریل کے ڈبوں میں بند کر کے دروازوں پر
 قفل چڑھا دیئے گئے اور راستہ میں دروازہ کو انہیں نہ کھولا گیا۔ گویا جانوروں یا مال کی طرح
 گاڑیوں میں بھر دیا گیا۔

ملتان میں رات لے آٹھ بجے کے قریب ہم ملتان پہنچے۔ رات کی تاریکی میں ہر
 پر بستر اٹھائے ہوئے، اسٹیشن سے سبیل کی طرف کشاں کشاں
 چل دیئے، جہاں جانوروں کی طرح بے آب و روانہ ہی بند کر دیئے گئے۔ ہم دو دن ملتان جیل
 میں رہے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ شرکدہ رہتا ہے؟ بازار کہاں ہے؟

کراچی جیل میں | کراچی جیل نسبتاً آرام دہ تھی، یہاں پہنچتے ہی ہتھکڑی اور آڑے ڈنڈے سے نجات مل گئی فقط آہنی بڑی زیب تن ہی۔ یہاں

قیدیوں کو رات کے وقت بند بھی نہیں کرتے تھے، بلکہ انہیں اجازت تھی کہ کھلی فضا میں چٹائیوں پر جہاں چاہتے سو جاتے۔ پھر یاد جیل کی تفصیل پر پشت کرتے رہتے تھے۔ دو برس کے بعد یہاں پہلی مرتبہ دکنے موتیوں سے جڑے سیاہی مائل نیلگوں آسمان کے نیچے سوئے دیگر جیل خانوں کی نسبت یہاں قیدیوں کو سنایت عمدہ کھانا ملتا تھا۔ گھی سے چڑی ہوئی گندم کی ڈٹیاں عمدہ ترکاری اور گوشت کا مناسب انتظام تھا، لیکن آرام کے یہ دن جیسے پاک جھپٹتے گزر گئے۔

صبح سفر، شام سفر | ایک ہفتہ کراچی ٹھہرے، آٹھویں سوز ہمیں بھری جہاز میں بوریوں کی طرح بھر کر بھیج دیا گیا۔ بادبانی جہازوں اور

سمندر کا نظارہ ہم نے سب سے پہلے کراچی میں دیکھا۔ جہاز چونکہ بہت چھوٹا تھا اور قیدیوں کو ہتھ خانے میں بھر دیا گیا تھا، اس لیے سب کی زبان پر تھا ہے

ہائے تنگ است مرداں بسیار

وقتا رہنا عذاب النار

لگتا تھا کہ جہاز ابھی تھوڑی دور سمندر میں گیا تھا کہ دریا کے تالیم اور موجوں کی طغیانی کی وجہ سے ڈنگ لگانے لگا، جس سے قیدیوں کو قے اور متلی شروع ہو گئی۔ جگہ کی قلت کی وجہ سے ایک دوسرے کے اوپر ہی قے کی جارہی تھی، جس سے تکلیف میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ جہاز میں کچھ مسلمان بھی سوار تھے جو قیدی نہیں تھے۔ انہوں نے ہمیں مولوی سمجھتے ہوئے بڑی تواضع کی۔ دو تین روز کے بعد بڑی مشکلات برداشت کرتے ہوئے، ہم بمبئی کی بندرگاہ میں داخل ہوئے وہاں میلوں تک ہزاروں جہاز کھڑے تھے بلکہ جہازوں کی کثرت کے باعث سمندر جہازوں کا جنگل معلوم ہو رہا تھا۔

جہاز سے اترے تو ہمیں بذریعہ ریل بمبئی کے جیل خانہ میں لے جایا گیا، جو کہ وہاں سے

بارہ میل تھا۔ بمبئی میں پارسی مرد عورتیں کثرت دیکھنے میں آئیں۔ یہ لوگ بڑے خوبصورت اور مالدار تھے اور آتش پرست زردشت کی است سے تعلق رکھتے تھے۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ کی چڑھائی کے وقت ایران سے بھاگ کر ہندوستان کے اس حصے میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ جہاں تک ہمیں دیکھنے کا موقع ملا بمبئی شہر بھی ایک ٹاپو ہے۔ ایک بند باندھ کر اسے برعظم ہند سے ملا دیا گیا ہے۔ بمبئی اور تھانہ کے درمیان سمندر بہتا ہے، اس کے پانی کو کھیتوں اور کھادوں میں روک دیا جاتا ہے۔ سمندر کا نلکین پانی جب سورج کی حرارت سے خشک ہوتا ہے، تو وہ خود بخود عمدہ نمک بن جاتا ہے۔ ریلوے لائن کے کنارے ہزاروں من نمک کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ناریل کا درخت اور اس کا تازہ پھل بھی ہم نے پہلے پہل بمبئی میں دیکھا۔

بمبئی کی عورتیں اپنی ساڑھی کو ایسے باندھتی ہیں جیسے مرد دھوٹی کو۔ یہاں کے ہندو بڑی بڑی گمڑیاں استعمال کرتے ہیں، جو سر پر ایک ٹوکر سے کی طرح رکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس علاقے کی زبان گجراتی یا مرہٹی ہے۔ جب ہم ریل سے اتر کر تھانہ کے بازار میں جیل کی طرف پیدل جا رہے تھے، تو ہمارے چند قیدی ساتھیوں نے کچھ مٹھائی کی دوکانوں کو لوٹ یا اور بے محابہ مال مسروقہ کھانا شروع کر دیا۔ دوکاندار انہیں قیدی سمجھ کر خاموش ہو رہے بلکہ بعض دوکاندار تو بہت خوش ہوئے اور انہوں نے قیدیوں کے منہ میں مٹھائی پڑنے کو بڑا پسند کیا۔

تھانہ جیل | چلتے چلتے شام کے قریب ہم تھانہ جیل کے دروازہ پر پہنچے۔ جیل کیا مرہٹوں کے وقت کا ایک بڑا مستحکم اور مضبوط قلعہ تھا، جس کے چاروں طرف ایک بڑی گہری اور پختہ خندق بنی ہوئی تھی۔ جیل میں داخل ہوتے ہی ہماری تلاش ہوئی اور ہم سب کے جوتے اتروائے گئے، جنہیں جاتے وقت بھی واپس نہ کیا گیا۔

سنائے کہ ایک دفعہ کسی دل جلے قیدی نے داروغہ جیل کو جوتے مارے تھے، جس کی وجہ سے یہاں یہ قانون بنا دیا گیا کہ کوئی قیدی جیل میں جو تانپہنے بلکہ ننگے پاؤں رہے تاکہ کوئی دوبارہ ایسی نامعقول حرکت نہ کر سکے۔

رات کو بھی جوار کی دو دو روٹیاں اور تھوہر کی دال دے کر علیحدہ علیحدہ کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا۔ تاہم ایسی کئی باعث دوسرے دن پنجابی قیدیوں کو گندم خور ملائے کے باشندے سمجھتے ہوئے گندم کی روٹیاں ملنے لگیں اور اس کے بعد تو یہ قانون بنادیا گیا کہ پنجاب کے قیدیوں کو یہاں گندم ہی کی روٹی دی جائے گی۔ صبح ہوئی تو ہمیں پتھر توڑنے کی مشقت دی گئی، جسے مشکل تمام ایک دو دن کیا۔ ہمارے پہنچنے کے بعد یہاں درسی بانی کا کام بھی شروع کر دیا گیا۔ پنجابی قیدی اس کام کے مستمقر ہوئے انہوں نے مجھے اور مولانا کھٹی علی صاحب کو درسی باغوں کا استباد فابریک کے اپنے ساتھ لے لیا اور اس طرح ایک مہینہ بڑے آرام سے گزارا۔

بھٹی کی طرح اس جیل میں بھی مرہٹی زبان کا دفتر تھا۔ اردو اور فارسی ڈاں یہاں بھی ناخواندوں میں شمار ہوتے تھے۔ کراچی اور تھانہ کے دفاتروں کا حال دیکھ کر یہاں یقین ہو گیا کہ اب باقی عمر ہم ناخواندوں میں شمار ہوں گے اور قلم پڑنے کی نوبت شاید ہی کبھی آئے۔ اس جیل کا دروغہ ایک برہمن اور بڑا لشکر آدمی تھا مگر نائب داروغہ ابراہیم مسلمان تھا اور حتی المقدور ہماری بڑی تواضع کیا کرتا تھا۔ ایک مہینہ گزارنے کے بعد یہاں سے بھی کوچ کی تیاری ہوئی۔ اس مسلمان نائب داروغہ نے ہماری بھاری بیڑیاں اتر دوائیں اور ان کی بجائے ٹکی بیڑیاں ڈلوادی تھیں۔ ہندوستان کے جیل خانوں میں درسی لوگوں خصوصاً شریفوں کو بڑی مشکل ہے مگر کوٹ پٹن والے کی بڑی عزت ہے خواہ وہ یورپین ہوں یا ہندوستانی باشندے، دونوں کو صاحب لوگوں کی طرح بڑا چین ہے۔

جہاز ۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو بھٹی سے کالپانی روانہ ہوا۔ یہ جہاز کالے پانی کو روانگی انگلینڈ کا بنا ہوا تھا۔ تمام عہد بھی انگریزوں پر مشتمل تھا۔ جب جہاز نے لنگر اٹھایا، تو سرے پر کھڑے ہوئے تمام اسیران بلانے اور وطن پر آخری محبت بھری نظر ڈالی۔ کچھ قیدی ایسے بھی تھے جن کی محبت کا محور، گھر بار، کھیتی باڑی، ماں باپ، بہن بھائی اور اولاد تھی اور انہیں یہ خیال بھی شدت سے ستارہا تھا کہ وہ جیتے جی اپنے اعزاء و اقارب پیاروں

راق دلاؤں اور سرسبز و شاداب کھیتوں کو بھی دیکھ سکیں گے یا نہیں؟ — لیکن ان میں سے کچھ نیک بخت ایسے بھی تھے جن کے ماشیخیل اور قلب و نگاہ کے کسی گوشے میں بھی ان میں سے کوئی چیز نہ تھی۔ ان کی محبت کا مرکز و محور صرف وہ دعوت حق تھی جس کے لیے انہوں نے اپنی قیمتی سے قیمتی متاع کو قربان کر دیا تھا، وہ اپنی کشتیاں ہلا کر آ رہے تھے، انہیں اس بات کی قطعاً پرواہ نہ تھی کہ وہ ایک ایسی بھیا تک بگڑ جا رہے ہیں، جہاں کے شب و روز نامعلوم کتنے کرناک ہوں گے۔ انہیں خیال تھا تو صرف اس تحریک کا ہے کہ وہ ناک و خون میں تڑپ تڑپ کر سیراب کر رہے تھے۔ جب تک ساحل نظروں سے اوجھل نہ ہوا، قیدی اپنے اپنے خیالات میں گم گم حیرت کی تصویر بنے اسے نکتے رہے۔ جب نظروں سے اوجھل ہو گیا تو کتنے ہی دلوں سے اٹھنے والا دھواں، عارض کے زہر میں پہنچ کر پانی کے قطرات کی صورت اختیار کر گیا۔ اب وہ تھے، ان کے زخاں پر شبنم کے قطرات جیسے آنسو یا پھر چار سو تہہ نظر تک پھیلا ہوا سمندر کا پانی۔ ان کے جذبات کی طرں سمندر بھی رفتہ رفتہ غلیانی رنگ اختیار کرتا گیا۔

دریا کو اپنی غلیانیوں سے کام

کشتی کسی کی پار ہو، یا درمیاں رہے

سمندر کی قلاطم تیزیوں کے باعث اکثر قیدی بیمار پڑ گئے، ایک بے پارہ پنجابی قیدی داغ مفارقت بھی دے گیا، جنہم قاعدۂ شریعت کے مطابق اسے غسل دیا، کفن پہنایا اور نماز جنازہ پڑھ کر اس کی لاش کے ساتھ بہت سے پتھر باندھے اور اسے سمندر میں چھوڑ دیا۔ سیلون پہنچے تو سمندر کا قلاطم مزید شدت اختیار کر گیا۔ سینکڑوں ٹن وزنی جہاز، ایک ننھے سے بٹے گیند کی طرح پانی کی سطح پر اپھل رہا تھا۔ پہاڑ کی طرح دیو قامت اور بلند و بالا موتیوں کی طرح سے آتیں، کبھی دوسری جانب سے اور اسے بری طرں ہلا کر رکھ دیتیں۔ کبھی اوپر سے گزرتیں اور کبھی نیچے سے اور یوں معلوم ہوتا کہ جہاز ابھی غرق ہو جائے گا۔ نوبت کے مارے لوگوں کا برا حال تھا۔ وہ چیخ و پکار کر رہے تھے۔ آخر کار کئی گھنٹے بعد طوفان تھا اور لوگوں کی جان میں جان آئی

۳۴ ویں دن ۱۱ جنوری ۱۹۶۶ء کو جہاز قبل از دوپہر پورٹ بمبئی روانہ کیا گیا۔ انبار سے لے کر انڈمان کے پانیوں میں داخل ہونے کی کل مدت ۱۱ ماہ ہے۔ سینکڑوں چھوٹے چھوٹے برے بھرے بڑے دورے پھیلی ہوئی گہری سبز چادر کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ اب ساحل بھی نظر آ رہا تھا۔ قیدیوں کی ایک جماعت عرس پر آکر کھڑی ہو گئی۔ دور سے سمندر کے کنارے کے کالے کالے پتھر ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے بھینسوں کے بھنڈے کے بھنڈ پانی میں بھر رہے ہوں۔ ایک کشتی میں پورٹ بمبئی کے خانہ آپسنے اور جہاز لنگر انداز ہو گئے۔ میں نے ایک ہندوستانی ملاج سے پوچھا کہ یہاں کشتی اور محروم کی بھی کچھ قدر ہے یا نہیں؟ دوسرا سوال میں نے یہ پوچھا کہ یہاں کا دفتر کس زبان میں ہے؟ اس نے قرینہ سے معلوم کر لیا کہ یہ شخص ہندی ہے، چنانچہ اس نے میری تسلی کے لیے مبالغہ آرائی کرتے ہوئے کہا کہ یہاں کے حاکم اور مالک تو ہندی ہی ہیں۔ یہ مژدہ سن کر مجھے بھی کچھ تسلی ہوئی۔

جہاز لنگر انداز ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی بڑی کشتیاں پہنچ گئیں۔ تمام قیدیوں کو ان میں بٹھا کر انڈمان کے صدر مقام روس کی طرف روانہ کر دیا۔ ساحل سمندر پر ایک جم غفیر کھڑا تھا، وضع قطع سے سب لوگ پڑھے لکھے مولوی اور ہندی معلوم ہوتے تھے۔ بیسیوں لوگ سفید فافرا نہ لباس زیب تن کیے، ہمارے منتظر کھڑے تھے۔ ابھی ہم کشتی میں سواری ہی تھے کہ کنارے پر کھڑے ایک آدمی نے بلند آواز سے پوچھا:-

”محمد جعفر اور مولوی کچی علی صاحب بھی اس جہاز سے آئے ہیں؟“

”جی ہاں! وہ دونوں آئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

یہ سننا تھا کہ وہ لوگ پانی میں کود پڑے اور ہم لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ کشتی سے نیچے اتار لیا۔

ساحل پر قدم رنجہ ہوتے ہی، سب سے پہلے

یہ خبر ملی کہ مولانا احمد اللہ صاحب چھ ماہ قبل

۱۵ جون ۱۹۶۵ء کو یہاں پہنچ گئے تھے۔ یہ لوگ انہی کے بھائی ہوئے آئے تھے۔ آپ کو ہمارے

آنے کی خبر روز پچھلے پہنچنے والے جہاز کے ان قیدیوں نے دی تھی جو تھانہ جیل سے بھٹی تک ان کے ساتھ آئے تھے۔

مولانا احمد اللہ، انڈمان کے چیف کمشنر میرنشی سید اکبر زمان کے مکان پر مقیم تھے۔ بندرگاہ سے ہم سیدھے وہیں گئے۔ آپ کے ساتھ احمد بھی کئی معززین منتظر تھے۔ ملاقات کا یہ نظارہ بہت رقت انگیز تھا۔ مصافحے اور مصافحتے کے بعد بیڑیاں کاٹ پھینکی گئیں۔ عمدہ لباس پہلے سے تیار کر لیا گیا تھا۔ ہم نے گہرے کپڑے اتار دیے اور نہاد حوکر سے زیب تن کر لیا، پھر دسترخوان بچھا دیا گیا، جس پر انواع و اقسام کے لذیذ کھانے چنے گئے تھے۔ تین برس بعد پہلی مرتبہ پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اگرچہ اسی تاریخ سے ہم قید سے رہا ہو گئے تھے اور پھر کبھی بارک، قیدیوں کا لباس یا قیدیوں کا کھانا نہیں دیکھا لیکن اس کے باوجود ہم اٹھارہ برس تک کالے پانی میں مڑموں ہی کی طرح رہے۔

اسی شام سے گھر گھر ہماری دعوتیں ہونے لگیں اور وہ وہ نفیس اور عمدہ کھانے کھلانے لگے کہ ہندوستان میں کبھی نصیب نہ ہوئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ اب ساری عمر جیل کا کھانا کھانا پڑے گا۔ لیکن اس قدر مطلق جب یہاں نعم البدل عنایت فرما دیا تو یہ خیال دل سے محو ہو گیا۔

جب اس جزیرے میں پہنچے تو دیکھا کہ ہزاروں قیدی مرد عورتوں کی پشانیوں کو کھود کر ان کا نام، جرم اور لفظ دائم الحبس کندہ کر لیا ہوا تھا کہ وہ نوشتہ تقدیر کی طرح ساری عمر نہیں مٹ سکتا تھا لیکن تمام سکر ہے کہ ہمارے یہاں پہنچنے سے کچھ عرصہ قبل تمام عسکری سرکار میں یہ حکم موقوف کر دیا گیا۔ ہم اس دائرہ دائم الحبس سے محفوظ رہے۔

جزائر انڈمان خلیج بنگال کے مشرق میں ۹۲ درجہ ۴۷ دقیقہ طول شرقی

اور ۴۳ دقیقہ عرض شمالی پر واقع ہے۔ چھ سیریل کی مسافت پر واقع

ہیں۔ ایک ہزار جزیروں کا یہ مجموعہ ۱۴۶ میل کے رقبہ پر مشتمل ہے۔ علم طبقات الارض کے

جزائر انڈمان

ماہرین کا کہنا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ جزائر بڑے عظیم ایشیا سے ملے ہوتے تھے اور پھر حوادثِ نہاد اور سمندر کی موجوں کے باعث اولاً تہرہ عظیم ایشیا سے الگ ہو گئے ثانیاً ایک دوسرے سے بھی علیحدہ ہو گئے اور چھوٹے چھوٹے ہزاروں جزایروں میں تقسیم ہو گئے۔

کلاکتہ سے آئبرٹ یہاں پانچ روز میں پہنچتا ہے اور رنگون سے تین روز میں۔ مولین یہاں سے تین سبیل مشرق و شمال میں، سنگاپور چار سبیل مشرق و جنوب میں، پانگ تین سو پچاس میل مشرق میں، نکوباریا نوکڑی اسی میل جنوب میں، مدراس آٹھ سو میل مغرب میں اور سنگا آٹھ سو میل مغرب و جنوب میں واقع ہے۔ سب جزائر پہاڑ ہیں، ہوا زمین بہت کم ہے۔ یہاں سب سے اونچا پہاڑ نوٹ ہریٹ ہے، جو سطح سمندر سے ۱۱۱۶ فٹ اونچا ہے۔

یہاں پانی کا کوئی ندی نہ باری نہیں ہے۔ موسم برسات میں بعض اونچے ٹیلوں سے پانی کے بہنے بہا کرتے ہیں، لیکن ایام خشکی میں بند ہو جاتے ہیں۔ کنوئیں وغیرہ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ پورٹ بلیر کے زیریں علاقے میں گندھک کا ایک پہاڑ ہے، جس سے ہر وقت آگ کے شعلے نکلنے رہتے ہیں۔

یہاں کے جنگلات میں شزیہ کے علاوہ اور کوئی چرپا یہ، درندہ یا پرندہ نہیں ہے۔ لہا پابیل یہاں کا ایک عمدہ تختہ ہے، جو قوتِ باہ کے لئے اسی مقصود سے بھی بڑھ کر سمجھا جاتا ہے اور سونے پاندی کی طرح بہت گراں ہوتا ہے۔ جنگلات میں ہزار ہا قسم کی عمدہ اور پائیدار لکڑی موجود ہے اور ہمارے علاقے کی لکڑی سے بالکل مختلف ہے۔ بید کی قسم کا ہے اور اس کی لکڑی دیگر ممالک میں بطور تختہ بھی جاتی ہے۔ کالی ناگنی کی طرح عقیق البحر کی چھڑیاں، ہزار ہا قسم کی گندہ رنگ کی کوڑیاں اور طرح طرح کی پھیاں یہاں کے سمندر سے نکلتی ہیں اور دوسرے ملکوں میں بطور تختہ بھی جاتی ہیں۔

آم، اٹی، جامن، کھل، بڑیل، جائیل اور پان وغیرہ گرم ملکوں کے درخت یہاں کے جنگلات میں خود بخود

پیداوار اور آب ہوا

اگے ہوتے ہیں۔ نیگل کو ساف کر کے پچاس سو گاؤں آباد کیے گئے ہیں۔ ہر قسم کی ترکاری، گرم ملکوں کے پھل اور دھان، مکی، جوار، سونگ، ماش اور دیگر کثرت سے یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ سرد ملکوں کے اناج گندم اور چنا وغیرہ بالکل پیدا نہیں ہوتے۔ اس کا حکومت نے انتظام کر رکھا ہے کہ وہ ملک سے گندم اور چنے وغیرہ لاکر سات پائی فی پونڈ یعنی سو آٹھ فی سیر کے حساب سے فروخت کرتی ہے۔ یہاں غلے کا ذخیرہ ہمیشہ ایک ہوتا ہے اور اس ملک میں کبھی قحط بھی نہیں پڑتا۔

اس جزیرے کی آب و ہوا اتنی عمدہ اور صحت بخش ہے کہ ردے زمین پر اس کی مثال نہیں ملتی۔ جبینہ، چیک، وائی بنجار اور اشوپ چشم وغیرہ متعدی امراض یہاں بالکل نہیں ہوتے۔ میں برس کے موسم میں ہم نے نہیں سنا کہ کوئی آدمی ان میں سے کسی بیماری میں مبتلا ہوا ہو۔ یہاں سرد اور کپڑوں میں بڑی نہیں پڑتیں اور نہ ہی پتو اور مچھر جیسے موذی جانور ہوتے ہیں۔ خط استوا سے قریب ہونے کے باعث یہاں بارش بکثرت ہوتی ہے اور دن رات برابر ہیں۔ سردی کی شدت ہوتی ہے نہ گرمی کی بلکہ سارا سال موسم معتدل رہتا ہے۔ دسمبر اور جنوری کی راتوں میں بھی صرف ایک پاد اور ٹھنڈے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سرائی کپڑوں کا بالکل دستور نہیں، کوئی رضائی بناتا ہے۔ ٹوٹی، ردی ہوتی ہے نہ دھنیا، خزاں ہے نہ بہار بالکل سارا سال موسم معتدل رہتا ہے اور بارہ مہینے درخت بھرے پھرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ حکیم و علیم نے موسموں کو یہاں کے جنگلیوں کی رعایت رکھتے ہوئے بنایا ہے، جو کہ ہمیشہ ہلر زلزلہ برہنہ رہتے ہیں۔ اگر گرمی سردی کی شدت ہو تو یہ برہنہ مخلوق خدا فوراً ماک ہو جاتا۔ بارش تو اس کثرت سے ہوتی ہے کہ مٹی سے دسمبر تک پورے آٹھ مہینے بادل بہتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مکانوں کی چھتوں کو ڈھلوان دار بنایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی کچی مٹی چھتیں یہاں کی بارش کا ایک دن بھی مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ بارش تو موسلا دار ہوتی ہے لیکن اگلے پڑتے ہیں، نہ کبھی آندھی آتی ہے۔

ان جزائر کے جنگلات نہایت گنجان اور دشوار گزار ہیں۔ ان میں درخت اتنے اونچے ہوتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب کسی درخت کو کاٹ کر گرایا جاتا ہے، تو اس کی ڈالیوں اور شاخوں سے سینکڑوں گز تک زمین متاثر ہوتی ہے۔ یہاں کے سانپ اور بھجوریں زہر نہیں لیکن لکھنور سے بہت زہریلے ہوتے ہیں۔

جنگلات میں زمانہ قدیم سے ایک وحشی اور ماورزاد قوم آباد چلی آرہی ہے۔ مرد عورتیں بالکل کپڑا نہیں پہنتے اور نہ ہی انہیں کپڑا ملتا ہے۔ ان کا ابھی تک صحیح حال بھی دریافت نہیں ہو سکا کہ وہ کس ملک سے اور کب آکر یہاں سکونت پذیر ہوئے ہیں، ہمیشہ سے وحشی چلے آ رہے ہیں یا کبھی ہندو بھی تھے، جیسا کہ مشہور تھایہ جنگلی آدم خور نہیں ہیں۔ ان کے بدن پر بال بھی ہیں۔

انڈمان کی نوآبادی | سو برس کے قریب ہوئے، ایک جہاز ران بیٹینٹ بلیر نے نے آکر یہاں سب سے پہلے لنگر ڈالا تھا۔ اسی وجہ سے اس جزیرے کو پورٹ بلیر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس وقت بھی سرکار نے تجویز کیا تھا کہ قیدیوں کو یہاں بھجور دیا جائے اور ان کو یہاں رکھا جائے گا لیکن یہ جزیرہ آباد ہو کر، آب و ہوا کے نامزدی جوڑنے کے باعث ۱۸۹۶ء میں پھر اجڑ گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سرکار کو پھر ضرورت محسوس ہوئی کہ اسے آباد کیا جائے۔ کیونکہ آزادی کی جنگ میں حصہ لینے والے کئی ہزار "باغیوں" کو جیل میں رکھنا ممکن نہ تھا، چنانچہ ملحقہ ۱۸۵۷ء سے بغاوت کے جرم میں ماخوذ قیدیوں کو یہاں بھیج کر اس جزیرہ کو دوبارہ آباد کر دیا گیا ہے۔

اصلی باشندے | شروع شروع میں جب قیدی یہاں آکر آباد ہوئے، تو مدت تک جنگلی لوگوں نے سخت مخالفت کی، چنانچہ انہوں نے یہاں کے پہلے سپرنٹنڈنٹ اور کمشنر ڈاکٹر واکر کے عہد میں ایک بہت بڑی فوج ظفر موج کے ساتھ ہندو اور ابروڈین پر حملہ کر کے بہت خون خرابے کیے تھے لیکن اب سرکار

کی حکمت عملی اور ملائت کے باعث فرمانروا بن گئے ہیں اور جنگل یا بستی میں جہاں کہیں ملتے ہیں، بڑی خاطر داری سے پیش آتے ہیں۔

ان لوگوں کا قد چار سے پانچ فٹ چار انچ تک لمبا ہے۔ شکل و صورت میں بالکل حبشیوں جیسے ہیں۔ سیاہ فام گول سر، آنکھیں ابھری ہوئیں، سر پر بھیر کے سے بال مگر نہایت مضبوط اور قوی، یہ ان کا علیہ ہے۔ کل جزائر انڈمان میں ان کی بارہ ذاتیں ہیں۔ ہر ذات کی زبان دوسری سے بہت کم ملتی ہے۔

یہ جنگلی اس بات کے قائل ہیں کہ خدا آسمان میں بہت

مذہبی خیالات

ہے، وہی بر چیز کا خالق ہے اور سب سے بڑا ہے۔ وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، آسمان میں اس کا نظارت عمدہ اور نفیس محل ہے، اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اسی کے گھر سے پانی برتا ہے، بجلی کا شعلہ اور کرک بھی اسی کے پاس سے آتی ہے، موت بھی اسی کے حکم سے ہوتی ہے، بھلائی اور رزق بھی وہی دیتا ہے، ان جنگلیوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ چانا پالک اس کی بیوی ہے اور اسے بھی فنا نہیں اور نہ ہی وہ کسی سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کا کام ہے کہ سمند میں مچھلیاں پیدا کرے، وہی مچھلیوں کو آسمان سے گراتی ہے۔

یہ لوگ شیطان کے بھی قائل ہیں اور سمجھتے کہ سب بڑے کام شیطان کرتا ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ شیطان دو ہیں ایک زمین کا جس کا نام ارم چوگلا ہے۔ جب زمین پر کوئی ناگہانی موت سے مر جاتا ہے، تو یہ سمجھتے ہیں کہ ارم چوگلانے مار ڈالا ہے۔ ایک سمند کا شیطان ہے جس کا نام جو رو وندلا ہے۔ جب کوئی ڈوب کر مر جاتا ہے، تو کہتے ہیں کہ اس کو جو رو وندلانے مار ڈالا ہے۔ یہ لوگ فرشتوں کے بھی قائل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ مذکور ٹوٹ دونوں جنس سے ہیں جنگلی میں رہتے ہیں اور انسانوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ لوگ بھوت پریت کے بھی قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ انہیں کچھ اختیار نہیں ہے۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ یا کسی دوسری چیز کی قطعاً عبادت نہیں کرتے۔

یہ لوگ طوفانِ فوج کے بھی قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ زمین پر ایسا طوفان آیا تھا کہ ساری دنیا ڈوب گئی تھی اور ان کے بزرگ ایک کشتی بنا کر اس میں سوار ہو گئے تھے اور ایامِ طوفان میں بہت دنوں تک اس کشتی میں سوار رہے۔ جب طوفان ختم ہوا تو وہ کشتی جزائرِ اندمان کے پہاڑوں میں سے کسی ایک پہاڑ پر آکر رک گئی تھی۔

یہ لوگ دوسے زیادہ گنتی نہیں جانتے، جب وہ سے زیادہ کسی چیز کی گنتی کرنی ہو، تو انگلیوں پر شمار کرتے ہیں۔ یہ ہمیشہ مادرِ زاد برہنہ رہتے ہیں البتہ عورتیں اندامِ نہانی پر ایک چھوٹا سا کپڑا ڈال لیتی ہیں۔ مرد عورتیں جسم کے کسی حصے پر بال رکھنے کے قائل نہیں جسم کے تمام بالوں کو بوتلوں کے ٹکڑوں کے ساتھ تراش ڈالتے ہیں۔

ان کے ہاں شادی بیاہ بھی نہایت سیدھے سادے طریقے پر ہوتے ہیں۔ شادی کے وقت دولہا اور دلہن دونوں کو گہر و رنگ کی چربی سے رنگ دیا جاتا ہے۔ شادی کے موقع پر قوم کے تمام افراد جمع ہوتے ہیں۔ اجتماع میں ایک آدمی بطور قاضی نظر آتا ہے، وہی دولہا کو اٹھا کر دلہن کے پاس لے جاتا ہے اور دولہا کے سامنے بہت سے تبرکات رکھ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ان سے شکر رکے اپنی عورت کی پرورش کرتا اور بھر دیتی تفسیرِ جہادِ ادا کے ساتھ کہتا ہے ”اب اک“ یعنی بے جاویہ تمہاری بیوی ہے۔ یہ کہنے کے بعد عقدِ پختہ ہو جاتا ہے اور پھر تالیاتِ دونوں کے ہاں طلاق ہے نہ جدائی۔ شادی کے بعد ان کے ہاں زنا بھی نہیں ہے۔

بچے کی پیدائش کے موقع پر بھی عورتیں پردے کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں بلکہ مردوں کے سامنے ہی بچوں کو جنم دیتی ہیں۔ پیدائش کے بعد ایک عورت پتوں کے ساتھ کھسپوں کو دور کرتی ہے جبکہ ایک دوسری عورت نال کاٹ کر بچے کو دھو دینے لگ جاتی ہے۔ پہلے دن بچے کو کوئی دوسری عورت دودھ پلاتی ہے لیکن دوسرے دن سے بچے کی ماں دودھ پلانے لگ جاتی ہے۔ دھنسل کے فوراً بعد زچہ چلنے پھرنے لگ جاتی ہے، جنگل کی ہر چیز کھاتی پیتی ہے، ان کے ہاں کسی قسم کے پرہیز کا قطعاً رواج نہیں۔ بچہ جب چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا ہے، تو پھر کٹھ

اس کا پہلا کھیل ہوتا ہے۔

ان لوگوں کا گھر بالکل چھوٹا سا ہوتا ہے۔ صرف چار کھجے کمرے کر کے، ان پر پتے ڈال لیتے ہیں اور ایک چندہ زدہ آسرا بنالیتے ہیں۔ ان کے گھروں میں جا کر دیکھو تو میاں بیوی کے علاوہ اور کوئی چیز نظر نہ آئے گی۔ تیرکمان ان کی اصل جائیداد ملکِ جان ہیں۔

یہ لوگ چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی بنا لیتے ہیں، جن کے ذریعہ ایک جزیرہ سے دوسرے جزیرہ تک آتے جاتے ہیں۔ یہ اپنے مردوں کی کھوپڑیاں بھی ساتھ ساتھ لیے پھرتے رہتے ہیں کسی دوسرے جزیرہ سے جب کوئی مہمان ان کے ہاں آتا ہے، تو اسے پہلے گھر سے ٹھوڑے سے فاصلہ پر بیٹھا پڑتا ہے۔ گھر والے اسے وہاں کھانا پہنچاتے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد وہ جس گھر میں چاہتا ہے چلا جاتا ہے۔ پھر سب اس سے مل کر روتے ہیں۔

یہاں کے باشندے کھیتی باڑی بالکل نہیں کرتے اور نہ ناچ کھاتے ہیں۔ ان کا کھانا مچھلی، سمندر کے کیڑے مکوڑے اور کھجورے وغیرہ ہیں۔ آگ پر نیم بریاں کر کے نمک و تاج کے بغیر کھاتے ہیں بعض درختوں کی جڑیں، پھلیاں، پھل، پتے، سبز کا گوشت اور شہد بھی ان کی خوراک میں شامل ہے۔

خطِ زنی کے یہ کہیں سے عادی ہوتے ہیں، اس فن میں شاید دنیا کی کوئی قوم بھی سبقت نہ لے جاسکے۔ یہ بلا کے تیر انداز ہوتے ہیں، ان کا نشانہ بہت ہی کم خطا ہوتا ہے۔ ان لوگوں میں کوئی حکم یا ڈاکٹر نہیں ہوتا، خون نکالنے ہی کو ہر مرض کا علاج تصور کیا جاتا ہے، جب کوئی بیمار ہو تب سے خود یا اس کا کوئی عزیز نہایت بے حد دیوانہ اناڑی پن سے بوتل کے ٹکڑوں سے زخم کر کے خون نکال دیتا ہے۔

جب کوئی مر جاتا ہے تو اسے ایک ٹوکری میں رکھ کر، اس کے گھٹنوں کو مروڑ کر اس کی پھانی پر لا کر باندھ دیتے ہیں، سامنے اعصار کو درخت کے ٹھیکوں سے لٹکے دیتے ہیں اور پھر قبر کھود کر اس میں گاڑ دیتے ہیں۔ قبر کے نزدیک آگ جلانے رہتے ہیں۔ ایک دو ماہ کے

بعد اس کی قبر کو کھود کر اس کا ماتم کیا جاتا ہے اور اس کی ہڈیوں کو سب عزیز آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اور پھر انہیں عز ورجان سمجھ کر ہمیشہ اپنے پاس رکھتے ہیں کبھی کبھی لاشوں کو گاڑنے کے بجائے پھان پر رکھ دیا جاتا ہے یا درختوں کی شاخوں پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ یہ دوبارہ زندہ ہونے، جزا سزا اور آخرت کے قائل نہیں ہیں۔

یہ لوگ ناچنے گانے کے شوقین ہیں گنا چنے گانے کے آلات سے یکسر نا آشنا۔ ان لوگوں کا کوئی مذہب نہیں۔ ان میں کسی مذہبی سرور یا رہنما کا بھی کوئی تصور نہیں، اس کے باوجود اخلاق، آدمیت، دیانت داری اور راست بازی کے اوصاف کے ساتھ متعین ہیں۔

ابتداء میں یہ لوگ روپیہ پیسہ کی قدر و قیمت سے ناواقف تھے۔ اگر کوئی شخص دیتا تو لے لیتے اور پھر دیکھ بھال کر زمین پر چھینک دیتے تھے، مگر اب تو بہت لالچی ہو گئے ہیں اور راہ گیوں سے پیسہ پیسہ کا سوال کرتے ہیں۔

ان کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ لڑکیاں جلد بالغ ہو جاتی ہیں اور تیس سال کی عمر میں تو بہت بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ بہت عرصہ ہوا دو دعائے نامی ایک شخص نے ایک جنگلی عورت سے شادی کی تھی مگر رہائی ہو جانے کے باعث اس بے چاری کو یہیں چھوڑ کر ہندوستان بھاگ گیا تھا۔

۱۸۵۵ء سے ۱۸۶۵ء تک ان جزائر کی آب و ہوا سب سے قاتل تھی۔ جس کو زخم ہو جاتا تو تیس سے روز مر جاتا اور چوتھے روز مر جاتا۔ زخم کیا ہوتا تو یا پیغام اہل ہوتا۔ جب آبادی یہاں شروع ہوئی، تو ان دنوں مرض اسکرولی (SCORLUTUS) بھی بڑے زور سے پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک جہازی بیماری ہے، جس سے منہ پک جاتا ہے پنڈلیاں سخت پتھر ہو جاتی ہیں اور آدمی مر جاتا ہے، اس مرض میں مبتلا ہو کر یہاں ہزاروں آدمی راہ گئے آخرت ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے پہنچنے سے ایک سال قبل یہاں کی تمام بیاباں ختم ہو گئی تھیں۔ اب تو آب و ہوا کی غبنی کے اعتبار سے یہ جزیرہ رشک کشمیر تھا، جہاں میں برس تک ہمارے

میں درو بھی نہ ہوا اور قید کی زندگی بڑے آرام و راحت کے ساتھ بسر ہوئی۔

بیادری کی کثرت اور آبادی کے نئے ہونے کی وجہ سے، ابتدا میں انگریزوں نے قیدیوں کے لیے بڑے نرم قوانین رکھے تھے اور ان سے اچھا سلوک کرتے تھے لیکن جب آب و ہوا ابھی ہو گئی اور آبادی بھی بڑھ گئی تو کالا پانی کے لیے ایسے ایسے سخت قانون بنائے گئے کہ لالمان الحفیظ۔ ہم جس زمانہ میں پہنچے آب و ہوا تو عمدہ ہو گئی تھی لیکن ابھی تک قانون میں سختی کے احکام جاری نہیں ہوئے تھے، اس وجہ سے ہمیں پہنچتے ہی ان جزائر کے عام قوانین کے مطابق حملہ سے، تنخواہیں اور آرام و آسائش کی سہولتیں میسر آ گئی تھیں۔

ابھی چند دن ہی ہوئے تھے کہ قانون میں سختی کی جانے لگی حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ نئے قیدیوں کو حکم تھا کہ دس برس تک سخت مشقت کریں، بھنڈا رے سے کھانا کھائیں دڑی کا کپڑا پہنیں، بارک میں رہیں اور انہیں کسی قسم کی سہولت دینا نہ کی جائے؛ چنانچہ قانون اندمان بڑے ۱۸۶۶ء سے ایک فقرہ بطور مثال لکھا ہوا ہے:-

”سزا جس بے ہوش دیا گئے شور کا مطلب یہ ہے کہ قیدیوں سے سخت سے سخت مشقت لی جائے اور کھانے پینے کو صرف اس قدر دیا جائے کہ جسم و جان

کار شتہ قائم رہ سکے“

مگر اس میں خیریت کا پہلو یہ تھا کہ ان قوانین کا اطلاق صرف نئے قیدیوں پر ہوتا تھا، ہم پرانے زندانی ان سے مستثنیٰ قرار دے دیے جاتے تھے۔

جنگ آزادی کے قیدی

میں نے یہاں آکر دیکھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی بدولت یہاں بیسیوں راجے، نواب، زمیندار، مولوی مفتی، قاضی، ڈپٹی کلکٹر، منصف، صدر امین، صدر الصدور، رسالہ دار اور صوبے دار وغیرہ

سب یوسفی ادا کر رہے ہیں۔

فلسفی اقلیاز

وہ معزز ہندوستانی جن کے آگے سینکڑوں ہزاروں نوکر تھے انہیں

بھی سیاہ رنگت اور ہندوستانی باشندے ہونے کی وجہ سے دوسرے چوڑے چہروں کی طرح مٹا بھڑا کھانا دیا جاتا اور عام لوگوں کے ساتھ ان سے بھی شنت لی جاتی تھی۔ مگر یورپین گورے بلکہ اکثر دولٹے کالے کھڑے بھی فقط کوٹ پستون کے شرف یا عیسائی کلمہ پڑھنے کی وجہ سے پٹن کے گوردن کے ہمراہ کھانے اور کپڑے کے سستی سمجھے جاتے تھے۔ ان کے رہنے کے لیے الگ بنگلے اور خدمت کے لیے جاتخواہ نوکر مامور تھے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جس گورے یا دولٹے کو لائسنس مل جاتا، اس کو تو پچاس روپیہ ماہوار تک نقد تنخواہ بھی ملتی تھی۔

۱۸۵۹ء میں ایک نیا جبریت انگریز واقعہ پیش آیا جسے دیکھ کر لوگوں کو رونانا آتا تھا اور وہ یہ کہ اس سال ایک بد بخت راجہ جگن ناتھ پوری — جس کے لیے مدت تک اخباروں نے بھی سرچھوڑا تھا — قید ہو کر کالا پانی پہنچا۔ چہرے کی رنگت کے سیاہ ہونے کے باعث وہ بے چارہ عام چوڑے چہروں کے ساتھ کھانا کھاتا اور شقت کرتا تھا۔ جب نازک مزاجی کے سبب مشقت نہ کر سکتا تھا تو جیل، بیت اور چکی پیسنے کی سزا پاتا، آخر کار ان صدموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جیل میں چل بسا۔

اسی دنوں مسٹر میٹیر نامی ایک کرائی بھی پہنچا جو کہ اودے سے قید ہو کر آیا تھا۔ وہ بھی اگرچہ رنگ کالا تھا، لیکن کوٹ پٹن پہننے اور یورپ کا باشندہ ہونے کے باعث، گوردن کے ساتھ عمدہ کھانا کھاتا تھا۔ رہنے کے لیے اسے ایک الگ مکان مل گیا، جس میں میش و آرام کا سب سامان تھا۔ مشقت کے بجائے اس پر یہ انعام کیا گیا کہ اسے ڈپٹی کمشنر کی کچہری میں کمرک لگا دیا گیا۔ چونکہ یہ کج بخت راجہ اور یہ خوش نصیب کرائی یہاں بیک وقت پہنچے تھے، اس لیے اس اختلاف سلوک اور طرنداری کو دیکھ کر ہر ایک کی آنکھیں اشکبار تھیں۔

ہمارے انڈمان پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد کا واقعہ ہے کہ سراوک کے راجہ برکس نے اپنی مدد کے لیے کچھ قیدیوں کو طلب کیا؛ چنانچہ حکومت ہند نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے پچاس قیدیوں کو جن میں سے اکثر منشی اور جمدار وغیرہ تھے، راجہ

برکس کے پاس بھیج دیئے۔ ان قیدیوں کے جانے کی وجہ سے کئی عمدہ عمدہ عہدے خالی ہو گئے تھے۔ اختیارات کے ذریعہ اور مولانا احمد اللہ سے ان لوگوں کو میری قابلیت کا علم ہو چکا تھا۔ اس لیے اللہ کے فضل سے جہاز سے اترتے ہی مجھے سپرنٹنڈنٹ اور چیف کمشنر کی کچہری میں محرر سیکشن دار یا نائب مینٹری مقرر کر دیا گیا۔ رہنے کے لیے ایک مکان اور خدمت کے لیے ایک تنخواہ دار نوکر بھی مل گیا۔ آزاد بندوں کی طرح یہاں چاہتا رہتا اور جہاں چاہتا جاتا، مطلق روک ٹوک نہ تھی۔

شادی خانہ آبادی

جب میں یہاں پہنچا تو میرا عالم شباب تھا، مگر کی تالیسیوں منزل میں تھا۔ مگر کے اس حصہ میں مجھ پر ہندوینی و دنیوی

قباحتوں سے خالی نہ تھا۔ اس لیے پہلے تو میں نے ارادہ کر لیا کہ اپنے ملک سے اپنی بیوی کو بلاؤں لیکن قانون اس سلسلہ میں مانع تھا۔ پھر میں نے چند ماہ بعد ایک نو آمدہ کشمیری عورت سے شادی کر لی، جو کہ نہایت کم سن تھی اور کسی بلائے ناگہانی میں گرفتار ہو کر یہاں پہنچی تھی۔ میرے جلالہ عقد میں آنے کے بعد بڑی دیندار اور خدمت گزار بن گئی۔

میں نے یہاں آ کر محسوس کیا کہ ہر وہ چیز جو ہندوستان میں مجھ سے چھوٹی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کا نعم البدل عطا فرمایا شروع کر دیا۔ جن لوگوں نے میری دشمنی پر کمر باندھی تھی، وہ ہی ایک ایک کر کے تباہ و برباد ہو گئے۔ حتیٰ کہ جب میں ہندوستان آیا تو ہر شخص حسب مدارج اپنے اپنی سزا حاصل کر چکا تھا۔

مولانا عبد الرحیم

زمانہ قید میں ۲۵ دسمبر ۱۸۶۷ء کو میں جزیرہ پرسپ

پینٹ میں تھا کہ مولانا عبد الرحیم صاحب بھی انڈمان پہنچ گئے پہلے تو آپ گھاٹ منشی مقرر کیا گیا اور پھر کچھ عرصہ بعد آپ کو ہسپتال میں محرر مقرر کر دیا گیا۔ تو برس تک سرکاری کام کرنے کے بعد انہوں نے بزازئی کی دکان کھولنے کا منٹ لے لیا،

جب رہائی ہوئی تو اس وقت بھی اسی پیشہ دوکانداری سے منسلک تھے۔

تین مہلک حادثے

سمندر کے کنارے آباد ملکوں، جہاز کے ملازموں اور

سیاحوں کو اکثر بحری آفات میں بھی مبتلا ہونا پڑتا ہے، جن سے ہندوستان کے آدمی سراسر نادان ہیں۔ کالے پانی میں بھی ہر سال بہت سے آدمی اور کشتیاں سمندر کی نذر ہو جایا کرتی ہیں، اس میں سال کی مدت میں مجھے بھی، بارہا ان آفات کا سامنا کرنا پڑا، مگر عین ڈوبنے کے وقت بلب چاروں طرف سے ناامید ہو کر اللہ رب العزت کی طرف رجوع کرتا، تو وہ رب تعالیٰ مجھے فوراً بچا لیتا تھا۔ ان بہت سی آفتوں میں سے جن میں یہ خاکسار وقتاً فوقتاً مبتلا ہو کر بچتا رہا، صرف تین واقعات کا اختصار کے ساتھ ذکر کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ میں روس سے جزیرہ پر سوپرنس مینیٹ کی طرف جا رہا تھا کہ پر سوپرنس مینیٹ کے نزدیک پہنچ کر ایسا طوفان باد و باران شروع ہوا کہ کشتی ڈنگا لے لگی اور ڈوبنے کے بالکل قریب تھی کہ موج کے ایک تھپیڑے نے اسے پلنگ کے نزدیک کر دیا۔ اس وقت میں اور ایک دو دوسرے مسافر مستعدی سے پل پر کود پڑے۔ ابھی ہمارے پاؤں پل پر لگے ہی تھے کہ ایک موج کے کشتی کو اس زور سے مارا کہ کشتی ریزہ ریزہ ہو گئی اور مسافر سخت زخمی ہو گئے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ابرڈین سے روس جاتے وقت بھی بالکل اسی طرح کے حادثہ سے دوچار ہونا پڑا۔ اس حادثہ میں بھی موجیں کشتی کو پل پر دے مارنا چاہتی تھیں کہ ہم کو در پل پر جا کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد کشتی پل سے ٹکرائی اور اس کے بزرے اڑ گئے، اکثر مسافر مجروح ہوئے اور بڑی مشکل سے ڈوبنے سے بچے۔

ایک تیسری مرتبہ ہماری کچہری کا سارا عملہ کشتی میں سوار ہو کر ابرڈین کو جا رہا تھا کہ عین وہاں ایک سخت طوفان آیا کہ سب لوگ ناامید ہو گئے اور موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا سمجھنے لگے۔ بارش اور ہوا بھی بڑے زور سے تھی۔ نزدیک کوئی کنارہ تھا نہ فریاد و رنج اندہیرا ایسا شدہ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اچانک کشتی کا مکان بھی ٹوٹ گیا اور کشتی پانی سے بھر گئی الغرض کوئی چارہ کار ہی باقی نہ رہا اور سب راستے مسدود ہو گئے تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس فریاد رس سے داد رسی کی جائے جو سب در ماندہ لوگوں کے ٹوٹے ہوئے

دلوں کا سہارا ہے۔ میں نے اپنے خدا سے لو لگائی، میں نے اپنے آقا کے دروازے پر دستک دینا شروع کر دی، میں نے اپنے مولا کے سامنے دستِ سول دراز کر دیا۔ ابھی دعا ختم نہ کی تھی کہ اچانک ہمارے پاس ایک بڑی کشتی نمودار ہوئی، جس میں سردار جمیل سنگھ سپرنٹنڈنٹ پولیس سوار تھے۔ انہوں نے ہمیں اس تبادلہ حال صحت میں دیکھ کر جھٹ پٹ اپنی کشتی میں لے لیا اور اللہ کے فضل سے کشتی صحت کمارے تک پہنچ گئی۔ اس واقعہ سے ”اَمَنْ يٰحَبِيبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَا“ کی ایسی تفسیر سمجھ میں آئی، جو آج تک کوئی واعظ، کوئی خطیب اور کوئی مفسر نہ سمجھا سکا۔

جنوری ۱۸۶۸ء میں خاکسار کا جزیرہ بد میں تبادلہ ہو گیا اور وہاں اسٹیشن مقرر ہو گیا۔ ۲۰ فروری ۱۸۶۸ء کو روس میں مولانا کی علی صاحب راہی فردوس ہوئے۔ میں ان سے بہت فاصلہ پر جزیرہ بد میں مقیم تھا، مجھے ان کی بیماری کی اطلاع بھی نہیں تھی مگر نقدیر عین اس وقت مجھے روس لے گئی جب ان کا جنازہ بالکل تیار تھا اور نماز پڑھنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ ہمارے مقدسے کے کئی آدمی ان کی تجیز و کفن میں شریک ہو گئے تھے۔ میری بیوی مولانا کی علی صاحب سے مرید تھی اور ان سے بہت محبت رکھتی تھی۔ اسے ان کی وفات سے بہت زیادہ صدمہ پہنچا، چنانچہ مولانا مرحوم کی وفات کے سوا دو مہینے بعد وہ نیک بخت بھی ۳۰ اپریل ۱۸۶۸ء کو راہی فردوس ہو گئی۔ میرا ہندوستان سے قید ہو کر جانا گویا اس بی بی کے خاتمہ بخیر کی تمہید تھا۔

تجارت

اس بیوی کی وفات کے بعد میں نے سب زیور و غیرہ فروخت کر کے تین سو روپے دہلی میں اپنی بیوی کے پاس بھیج دیئے تاکہ وہ جوتے اور دیگر سامان خرید کر میرے پاس بھیج دے کیونکہ ان دنوں پورٹ بلیر میں دہلی کا مال تنگے چوگئے دام پر فروخت ہوتا تھا۔ مگر یہ مال زیادہ تر راستہ میں ضائع ہو گیا۔ دہلی سے روانہ ہونے کی تاریخ سے دو برس بعد گل سڑ کر تھوڑا سا مال ۱۸۷۰ء کو میرے پاس

پہنچا جس سے مجھے صرف ایک سو پچاس روپے و سول ہرے اور ایک سو پچاس روپے کا خسار ہوا۔

اس ایک سو پچاس روپیہ کو بھی بی بی نے کلکتہ سے مال منگوانے کے لیے ایک دست کے پاس بھیج دیا، تو بنگالی باپوں نے مجری کر کے وہ ہنڈی کپڑوادی کیونکہ سکاری ملازم ہونے کی حیثیت سے تجارت نہیں کر سکتا تھا میں نے مال ایک سو دواگر کے نام سے منگوا دیا تھا اور ہنڈی ایک ایکسٹرا اسٹینٹ کشن کی طرف سے مٹی طلب مال کے لیے خط میری طرف سے لکھا ہوا تھا۔ خط بعد ہنڈی کپڑا لیا اور چیف کشن کے پاس پیش ہوا اور یہ میری سزا کے لیے کافی تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے اور ہنڈی دونوں کو بچا لیا۔ وہ سوداگر جس کے پاس ہنڈی بھیجی تھی، رقم وصول کر کے کلکتہ سے فرار ہو گیا۔ الغرض اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا کہ میں تجارت کروں، لہذا اس کے بعد کبھی تجارت کا ارادہ نہ کیا۔

بیوی کا انتقال

اس بیوی کی وفات کے بعد دو برس تک مجرور رہا۔ جزیرہ ہمد جہاں میری ملازمت اور قیام تھا، عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سی عورتوں نے مجھے شکار بھی کرنا چاہا مگر حفاظت غیبی شامل حال رہی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ہلاک نہ ہونے دیا۔ گواپنے عہدہ کی وجہ سے رات دن مجھے ان فاحشوں سے ملنا پڑتا تھا اور طرح طرح کے سرکاری کام لینے پڑتے تھے کہ وہ اکثر میرے گھر بھی آتی باقی تھیں اور مجھے شکار کرنے کی کوشش بھی کرتی تھیں لیکن جسے خدا رکھے اسے کون چکھے؟

میں نے یہ کیفیت دیکھی تو اپنی بیوی کو پانی پت سے پھر بولنا چاہا لیکن وہ راضی نہ ہوئی اور جب اس نے اپنی رضا کا اظہار کیا تو حاکم وقت نے میری درخواست نامنکور کر دی۔ اس لیے میں نے مجبوراً کسی نیک عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کر لیا اور بارگاہ الہی میں التجا کی کہ اللہ مجھے تجھے پسند ہوا پر وہ غیب سے اس کا انتظام فرما دے اور کسی نیک بخت سے میرا سونگ کرادے۔ ابتدا میں تو بعض دوستوں کے مشورہ سے یکے بعد دیگرے دو پنجابی مسلمان

عورتوں سے میرے نکاح کی بات چیت شروع ہوئی مگر طریق کی رضا مندی اور کسی ظاہری مانع کے نہ ہونے کے باوجود بات خود بخود موقوف ہو گئی۔ اس وقت تو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ بیل کیوں نہ منڈے چڑھ سکی، لیکن بعد میں جب دوسرے دو آدمیوں سے ان کی شادی ہوئی، تو معلوم ہوا کہ وہ صحیح کر دار کی مالک نہ تھیں۔ میں اس حفاظت غیبی پر شکر الہی بجالایا۔

دوسری شادی

ضلع المورہ کی برہمن قوم سے تعلق رکھنے والی ایک ہندو عورت ان دنوں نئی نئی قید ہو کر کالا پانی آئی اور ہمد میں عورتوں کی بارک میں اسے رکھا گیا۔ وہ نہایت خوش چلن اور حسیاد اور لڑت تھی مگر ہندو دھرم میں نہایت متعصب کسی مسلمان عورت کے نزدیک کھڑا ہونا یا اس کے کپڑوں کو چھونا بھی اسے گوارا نہ تھا۔ بارک کی مسلمان عورتیں تو اس کے تعصب کی وجہ سے تنگ آئی تھیں۔

میں نے ایک دن بریل میں ذکر اس سے کہا کہ اگر تو مسلمان ہو جائے تو دنیا و آخرت دونوں میں تیرے لیے یہ بہتر ہو گا اور دوزخ کی آگ سے بھی تجھے نجات مل جائے گی۔ میری بات سن کر اس نے نہایت حیرت کا اظہار کیا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ روزِ اول سے میرے بچوں کی والدہ ہونا، اس کے مقدر ہو چکا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ باوجودیکہ وہ کوہستان کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئی، جہاں اب بھی مسلمانوں کا نام و نشان نہیں لیکن وہ ہمیشہ شرک اور بت پرستی سے بیزار رہی، گوا سے بھی اس بیزاری کا سبب معلوم نہ تھا۔ اس کی وضع قطع اور عادات و اطوار کو دیکھ کر ایک جوتشی برہمن نے اس کی والدہ کو یہ کہہ دیا تھا کہ یہ لڑکی تم سے جلدی جدا ہو جائے گی۔

اپریل ۱۸۶۸ء میں جب میری کشمیری بیوی فوت ہوئی، انہی ایام کا تذکرہ ہے کہ اس برہمن عورت پر ایک ناگمانی مقدمہ ہو گیا، جس کے باعث یہ گرفتار ہو گئی۔ اس اجمال کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ایک لڑکی میری اس ہونے والی بیوی کے ساتھ ایک بے باک کنزین کے قریب کھیل رہی تھی، اتفاق سے اس لڑکی کا پاؤں پھسلا اور وہ کنزین میں گر کر

سخت مجروح ہو گئی۔ اگرچہ اس میں میری بیوی کا قطعاً کوئی تصور نہیں تھا لیکن ان دونوں لڑکیوں کے والدین کے درمیان سخت عداوت تھی۔ لہذا انہوں نے اسی دیرینہ عداوت کی بنا پر اس بے گناہ پر اقدام قتل کا کیس کر دیا۔ قانونی طور پر یہ مقدمہ اگرچہ اس لائق تو نہ تھا کہ اسے جس دودام کی مراد دی جائے، مگر اس حکیم و قدیر کو اسے میری بیوی بنانا منظور تھا، لہذا اسے اس جرم کی پاداش میں پورٹ بلیر پہنچا دیا۔

گرفتاری کی پہلی شب ہی تھی کہ اس نے بوقت سحر خواب میں ایک نورانی چہرہ بزرگ مسلمان کو دیکھا، جس نے اسے ٹھوکر مار کر کہا اٹھو! نماز پڑھو اور دعا کرو، تمہارے لیے قید ہونا بہتر ہے۔ اس نے ایسی صورت کا کبھی کوئی انسان دیکھا تھا اور نہ نماز و دعا کے الفاظ سے آشنا تھی۔ گھبرا کر بیدار ہو گئی۔ محافل میں سے ایک مسلمان سپاہی سے خواب بیان کر کے تعبیر پوچھی تو اس نے کہا کہ تو اس قید میں مزدور مسلمان ہو جائے گی۔

اس وقت یہ تعبیر اس کی طبع نازک پر نہایت گراں گزری اور اسے بالکل غیر ممکن معلوم ہوئی مگر قبولیت ازلی اور تعبیر مذکورے حتمی کی بنا پر اس نے میری پیشکش کو قبول کر لیا اور مسلمان ہو کر میرے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی۔

اتفاق سے انہی دنوں رمضان المبارک جلوہ فگن ہو گیا۔ رمضان کی ۲۷ تاریخ کو میں نے بڑے دھوم دھام سے ایک تقریب کا اہتمام کیا اور اسے مسلمان بنالیا۔ جب اس نے ارکان اسلام اور نازدغیرہ کے مسائل کو بخوبی سیکھ لیا تو میں نے حاکم وقت کو مطلع کر کے ہا پریل سنہ ۱۸۸۷ء کو اس سے شادی کر لی۔ صد ہا آدمیوں نے اس تقریب سعید میں شرکت کی اور خوبی قسمت کی بات یہ کہ حضرت مولانا احمد اللہ صاحب نے خطبہ نکاح پڑھا تھا۔ دوسرے دن بڑی شان و شوکت سے دعوتِ ولیمہ کا انتظام کیا گیا، جس میں بہت سے اچانے نے شرکت فرمائی۔

اس بیوی کے بطن اطہر سے اللہ تعالیٰ نے مجھے دس بچے عطا فرمائے، جن میں

سے آٹھ بچے اس وقت تک بقید حیات ہیں۔ یہ بیوی پورٹ بلیر سے میرے ساتھ نہایت بھی واپس آئی۔ اس نے گزشتہ بائیس برس نہایت حسنِ رفاقت، امانت اور عصمت کے ساتھ بسر کیے ہیں اور توجید و توکل میں بھی یہ بیوی لاثانی ہے۔

چند خطوط

پورٹ بلیر پہنچ کر میں نے حاجی محمد شفیع صاحب انبالوی کو وقتاً فوقتاً چند خطوط بھی لکھے، جن میں آرام و آسائش کے ساتھ زندگی بسر کرنے، شادی اور ملازمت کا ذکر کیا تھا۔ کچھ خطوط ان لوگوں کو بھی بھیجے جو بے تصور مسلمانوں کو چننا کر نیم رانی کی شکل میں ذلت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہیں حسرت میں مبتلا کرنے کے لیے میں نے اپنی راحت اور تائیدِ الہی کا مبالغہ آمیز الفاظ میں ذکر کیا لیکن ان میں سے کسی خط کا بھی جواب نہ آیا۔

اسی اشارہ میں مجھے معلوم ہوا کہ کسی نے سرکار کی خیر خواہی کے لیے، وہ خطوط گورنمنٹ ہند کو پہنچا دیئے اور ان پر خوب بحث ہوئی حتیٰ کہ سپرنٹنڈنٹ پورٹ بلیر سے بھی صحیح کیفیت کے متعلق استفسار کیا گیا۔ اگر اللہ کا فضل شامل حال نہ ہوتا، حکام پورٹ بلیر میرے لیے بلو وکیل نہ بھگڑتے اور مراعات کا سلب کر لینا پورٹ بلیر کے قاعدہ عام کے خلاف نہ ہوتا تو میرے لیے سخت مشقت کا حکم ہو جانا کچھ بعید نہ تھا۔ یہ اللہ کا خاص فضل ہی تو تھا، یہ اس کی طرف سے تائیدِ غیبی ہی تو تھی کہ جان لارنس بہادر گورنر جنرل مجھ جیسے غریب قیدی سے سخت مشقت لینے کا مستحق ہو اور مجھے سزا بھی سخت مشقتِ تاحیات کی مل چکی ہو لیکن اللہ تعالیٰ ایسے سخت بھگیلوں کے باوجود مجھے سخت مشقت سے بچالے۔

اللہ کی طرف سے ایک فضل یہ بھی تھا کہ جب ہم پورٹ بلیر پہنچے تو اس وقت یہاں کے سب حاکم مدراس کے تھے، وہ ۱۸۵۷ء کے معرکہ اور دہلیوں کی بغاوت سے واقف نہ تھے، اس لیے ان کے دل صاف اور سینے خالی از تعصب تھے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ نہایت حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا بلکہ ہماری غلش چلتی، خوش اخلاقی اور عمدہ

کارگزاری کے باعث ۱۸۵۷ء کے دیگر قیدیوں کی نسبت زیادہ مراعات سے نوازا۔
جب پہلی مرتبہ ڈاکٹر ہنٹر نے مرجع نمک لگا کر ہمارے مقدمہ کو رسی سے سانپ
اور رائی سے پہاڑ بنا کر پیش کیا اور لکھ دیا کہ وہابی اور باغی کے ایک ہی معنی ہیں اور بنگال کو
کے صاحب لوگ اس جزیرہ میں آنے لگے، تو ہم آلام و مصائب کا تختہ مشق بن گئے،
راہ چلتے ہماری طرف اشارے کیے جاتے اور وہ ہمیشہ اس گھات میں رہتے کہ انہیں
کب کوئی موقع ملے کہ قانونی جیل کی آڑ میں ایذا رسانی کے درپے ہو جائیں لیکن جب خدا
تعالیٰ جیسے محافظ حقیقی کی حفاظت نصیب ہو تو کون ہے جو تکلیف پہنچا سکے؟ میں نے بارہا
خدا کی نصرت کا مشاہدہ کیا کہ جب کوئی درپے تکلیف ہو تو محافظ حقیقی نے مدد اور اعانت
کا ایسا سامان کر دیا کہ دشمن منہ تلختے رہ گئے۔

ایک جھوٹا مقدمہ | ہنٹر ٹرنٹ کرنل مین کے مہم میں ایک بڑے یورپین افسر
کی تحریک سے میرے خلاف اعانت تعریف بے جا کا جھوٹا
مقدمہ کر دیا گیا، جس کی وجہ سے کرنل مین جیسا بے تعصب حاکم بھی مجھ سے برا فروخت ہو گیا اور اس
نے مجھے بذریعہ من فوراً عدالت میں طلب کر لیا، اس وقت بہت سے دوستوں نے مشورہ
دیا کہ جان بچانے کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے لہذا تم لاٹلی کا اظہار کر کے اپنی جان بچالو۔
میں نے دوستوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا: "کچھ بھی ہو میں تو بیس بولوں گا۔"

جب مقدمہ پیش ہوا تو سب سے پہلے مجھے طلب کیا گیا اور کرنل صاحب نے میرے
بیانات قلب بند کرنا شروع کر دیے۔ میں نے صحیح طور پر حرف بحرف بیان کر دیا کہ میرے سامنے
مسٹر ہیوڈ اور سیرید عالیہ نے مستی حمید خاں جمعدار مدنی کی جائیداد جہاں جہاں پائی، بطور خود
ضبطہ کر کے نیلام اور فروخت کر دی اور اس کا زرخش خود کھا گیا۔ میں محرر اسٹیشن ہونے کی
وجہ سے اس کے ہمراہ مزدور تھا..... میرا بیاں اس قدر ہوا ہی تھا کہ مسٹر ہیوڈ سے
تمام رقم حمید خاں مدنی کو واپس لگئی اور ہیوڈ کو جو کچھ سو روپیہ ماہوار کا اور میرا تھا ملازمت سے

برطرف کر کے ان جرائز سے بدکر دیا گیا۔ میں اپنے سچ کی برکت سے صاف بری ہو کر گھر چلا آیا
انہی ایام یعنی جنوری ۱۸۶۹ء میں لیٹینٹ پرائیمر۔ جو اس وقت کرنل اور قائم
مقام چیف کمشنر پورٹ بلیئر ہیں۔ کالے پانی میں اسٹنٹ ہو کر آئے تھے۔

عید الاضحیٰ کے موقع پر جھگڑا | اپریل ۱۸۶۹ء میں جب عید الاضحیٰ آئی تو ہم نے ایک
بیل خریدا اور دستور کے مطابق قربانی کا ارادہ کیا

مگر قربانی کے وقت بڑے کر کے ہندوؤں نے ہم سے بیل چھین لینا پامانگر ہمارے ساتھیوں نے
ان کے گلہ کو غیر واجبی قرار دیتے ہوئے بیل دینے سے انکار کر دیا۔ ہندو حسب عادت بڑے
جوش و خروش میں تھے۔ ہم نے عین اس وقت بیل کو قربان کر دیا، جب ہندو بیل کی قربانی
کے ساتھ ہماری قربانی کرنے کے لیے ہمارے سروں پر تلخ ہو کر کھڑے تھے۔ ہم مسلمان صرف
چار پانچ تھے جب کہ ہندو دوسو سے بھی زیادہ تھے۔ اتنی فلیل جماعت کے لیے یہی قریب مصلحت
تھا کہ وہ اتنی کثیر اور پُر جوش جماعت کا مقابلہ نہ کریں مگر مذہبی جوش اور دادائے فرض
نے ہمیں بھی مجبور کر دیا تھا۔ جب ہندوؤں کے سامنے بیل ذبح ہوا اور اس کی گردن سے خون
کے فوارے بہہ نکلے تو انہوں نے بڑا بلوہ کیا اور شور و شغب کے ساتھ آسمان کو سر پر اٹھالیا۔
ممکن تھا کہ دس بیس ہشتے خاک و خون میں تڑپ جاتے مگر پولیس اور اہل سیر کے جلد پہنچ جانے کے
باعث کشت و خون کی نوبت نہ پہنچی۔

ہندوؤں کی سازشیں | مقدمہ کچھری میں چلنے لگا۔ ہندو بڑے مالدار، صاحب
اقدار اور حکام کے منہ پر مڑے ہوئے تھے لیکن پرائیمر

صاحب کی کوشش اور امداد سے ہم لوگ نہ ہٹ گئے۔ میرے خیالات اور سمجھ بوجھ کی کیفیت جو
اب ہے اگر اس وقت بھی یہی ہوتی تو میں بیل کے بجائے بڑے کی قربانی کو ترجیح دیتا اور صد
آدیوں کے دلوں کو نہ دکھاتا۔

مباحث در پے آزار و ہرچہ خواہی کن کہ در شریعت ما غیر اذیں گنا ہے نیست

قربانی کے اس واقعہ کے بعد پورٹ میر کے سب ہندو آپس میں متفق ہو گئے کہ خواہ ہزاروں روپیہ خرچ ہو جائے ہم محمد جعفر کو سخت سزا دلا کر چھوڑیں گے۔ انہوں نے سزا باز کر کے مونگالال محرو کو جو میر سے ماتحت تھا اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اسٹیشن کے حساب میں تغیر و تبدل کر کے میر سے خلافت چوری اور غبن کا دعویٰ دائر کر دے؛ چنانچہ اس نے نیلام کے ایک حساب میں جو میری معرفت ہوا تھا، کمی بیشی کر کے سو روپیہ کا غبن میر سے ذمہ لگا دیا۔ فارسی اور انگریزی دونوں حسابوں سے ان رقم کی تصدیق کر کے بہت سے گواہ بھی بنالئے۔ اگرچہ منسلح دار کو اس کی خفیہ رپورٹ ہو گئی تھی مگر ابھی تک مجھے اس کا ردائی کا قطعاً علم نہ تھا۔ آخر کار ایک دن اور میر نے میرے گھر اچانک چھاپہ مارا اور سرکاری حساب کتاب سے متعلق تمام کتابیں اپنی گرفت میں لے لیں۔ میں نے سمجھا شاید میرے قتل کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ جب مجھے صحیح صورت حال کا علم ہوا اور پتہ چلا کہ دوسرے دن اس کیس کی تحقیق بھی ہو رہی ہے تو میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی زیر مر است کتابوں کو ایک گھنٹہ کے لیے حاصل کر کے اور اس ایک گھنٹہ میں جیسا سازی کی اس کا ردائی کو لیا سیٹ کر کے جو ایک مہینہ میں تیار ہوئی تھی، اپنا حساب ٹھیک کر دیا۔

دوسرے دن جرائڈانڈان کے اسٹنٹ پرنٹنڈنٹ پرائیمر صاحب کے زیر صدارت اجلاس میں تحقیقات شروع ہوئی۔ جب مذہبیوں کی نشاندہی کے مطابق کتابوں میں حساب دیکھا گیا تو وہ بالکل درست نکلا اور اس میں سرسوزی نہ تھا۔ پرائیمر صاحب چونکہ چند روز پہلے قربانی کے مقدمہ میں نہیں بری کر چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے فوراً کہہ دیا کہ یہ مقدمہ اس قربانی والے مقدمہ کے باعث محض عداوت اور دروغ گوئی پر مبنی ہے۔ اس نے مونگالال کو چھ ماہ کی سخت قید اور ایک ہندو ریٹرو ایک درجن کوڑوں کی سزا دی اور مجھے بری کر دیا۔ ہندو جج سے لال پیٹے ہوئے تھے انہوں نے کورٹ میں کھڑے کھڑے مجھ پر ایک دوسرا الزام چوری کا بھی لگا دیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مونگالال نے سزا پانے کے بعد

ہاتھ باندھ کر پرائیمر صاحب سے عرض کیا: "مفتوحہ کچھ میری عرض ہے" صاحب نے کتا بکھو! کیا ہے؟ اس نے کہا کہ حضور نے محمد جعفر کو بازار بنوانے کے لیے کڑی کے جو سرخ تھنے دیئے تھے، اس نے انہیں اپنے گھر میں استعمال کر لیا ہے اور ان سے گھر کے دروازے، ماتحت پوش اور صندوق بنالئے ہیں اگر حضور اسی وقت تکلیف گوارا فرمائیں تو میں وہ سب چیزیں محمد جعفر کے گھر سے کپڑا سکتا ہوں۔

مونگا جب یہ بیان دے رہا تھا تو میں سر جھکائے خداوند تعالیٰ سے دعا کر رہا تھا کہ اس آفت سے بچانا بھی تیرا ہی کام ہے۔ وہ سب چیزیں میرے گھر میں موجود تھیں اور اگر حاکم مجھ سے پوچھتا تو اثبات میں سر ہلانے کے سوا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مگر اس متقلب الطرب کی قدرتِ کاملہ کی کرشمہ سازی بغور سننے کے قابل ہے کہ مونگا کے جواب میں پرائیمر نے کہا کہ وہ تھنے تو ہم نے اسے دیا ہے۔ تھیں مخبری کرنے کا کیا حق ہے۔ نکل جاؤ کہ بخت میری عدالت سے اور مجھ سے فرمایا کہ تم گھر جاؤ اور آئندہ کے لیے ہوشیار رہو!

۱۸۶۹ء کا ذکر ہے کہ میرے گھر میں بدواسٹیشن کے قیدیوں کی خواہ کامیابی پانچ سو روپیہ موجود تھا۔ ایک رات گھر کی کھڑکی توڑ کر ایک چور اندر گھس آیا، میرے پیٹک کے نیچے جلتی ہوئی بی کو اس نے گل کر دیا، رقم ایک چھوٹے سے صندوق میں تھی جو کہ میری پائنتی کے پاس رکھا ہوا تھا۔ میں گہری نیند سو رہا تھا۔ میرا فکرمیرا دھبی ایک دوسری کوٹھڑی میں سو رہا تھا الغرض چور کے راستے میں کوئی چیز بھی مانع نہ تھی۔ وہ مال سیٹ کر جانے کے لیے پر تول رہا تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی، میں نے اندھیرا دیکھ کر اور کچھ آہٹ پا کر اپنے خادم مراد کو آواز دی دینا شروع کر دیا۔ چور خالی ہاتھ اور نامراد ہو کر فوراً بھاگ گیا اور اللہ رب العزت نے میری عزت رکھ لی اگر سرکاری روپیہ چوری ہو جاتا تو اس میں بظاہر سخت خرابی اور بربادی تھی۔

مارچ ۱۸۷۰ء میں میں نے ایک صیغہ پکاس روپے کی ایک ہندی مسٹر اسٹراپ کسٹرا

اسسٹنٹ کمشنر کی طرف سے منشی غلام نبی کے نام لکھتے بھیجی تھی، جس کے ذریعے میں اپنی شادی کے لیے بعض ضروری سامان منگوانا چاہتا تھا اور مال بھی ایک دوسرے تاجر کے نام سے منگوانا تجویز کیا تھا کیونکہ میں سرکاری ملازم تھا۔ مجھے ہنڈی بھیجنے کا اختیار تھا نہ مال منگوانے کا۔ یہ سب ناجائز کارروائی مخفی طور پر کی جاتی تھی۔

جب میں نے خط مع ہنڈی ڈاک میں ڈالا تو میرے دشمن، ہندوؤں کو بھی کسی ذریعہ سے اس کی خبر ہو گئی۔ انہوں نے کرنیل مین چیف کمشنر کو خبری کر کے اس خط اور ہنڈی کو کپڑا دیا اور ان کا منصوبہ یہ تھا کہ زیر ہنڈی کی ضبطی کے علاوہ مجھے سزا بھی دلائی جائے۔ مجھے بس خط اور ہنڈی کے پڑے جانے کا علم ہوا تو میں نے فوراً اپنے خدا کے دروازے پر دستک دی اور عرض کیا کہ اے اللہ! اس مشکل سے نجات بھی تو ہی دے سکتا ہے۔ دعا کے بعد پراخرو صاحب کے پاس جا کر میں نے سدا حال کہہ سنایا اور کہا کہ یہ لٹی درحقیقت اسی قربانی والے اللہ کی وجہ سے عداوت کھنچ رہی ہے۔ پراخرو نے کہا: فکر نہ کرو میں کرنیل مین سے ملاقات کر کے صورت حال دریافت کروں گا۔ الغرض پراخرو صاحب کرنیل مین کی کوئی پرگئے اور ان سے ملاقات کر کے میری ہنڈی اور خط دونوں واپس لے آئے اور مجھے دے دیئے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہندو تھا ہے دشمن ہیں، تم ہوشیار اور چوکنا رہا کرو۔

مولانا محمد حسن، انڈمان میں
اگست ۱۹۴۷ء میں میرا مزیدہ دوسرے روس تباہ ہو گیا۔ مئی ۱۹۴۷ء کو جب میں جزیرہ روس میں تھا، مولانا محمد حسن صاحب ہماری ملاقات کے لیے ٹپن سے پورٹ بلیر آئے اور ایک مہینہ رہ کر واپس وطن تشریف لے گئے۔

ایک دن جب مولانا بڑے ذوق شوق کے کشتی میں سوار ہو کر مولانا محمد اللہ صاحب کی ملاقات کے لیے روس سے واپس جا رہے تھے تو راستہ میں کشتی خوفانہ باران میں پھنس گئی، قریب تھا کہ گرداب میں ڈوگمگاتے ہوئے ڈوب جائے۔ مولانا کو کشتی کے ڈوبنے

کی بجائے زیادہ افسوس یہ تھا کہ مولانا محمد اللہ صاحب کی زیارت نصیب نہ ہو سکے گی۔ لیکن یہ فقط آزمائش تھی۔ چند بھونکوں کے بعد طوفان ختم گیا اور مولانا بخیریت ویرپہنچ گئے اور مولانا محمد اللہ صاحب سے شرف ملاقات حاصل کیا۔

ہماری گرفتاری کے بعد انگریزوں نے مولانا محمد حسن کو بھی پھنسا کر کالے پانی بھیجا چاہا تھا مگر اللہ کے فضل سے وہ محفوظ رہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس طرح بھی کالے پانی بھیج کر اور مصائب بھری میں مبتلا کر کے اسیرانہ کالہ پانی کے اجر و ثواب میں شریک کر دیا۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں چیف کمشنر کرنیل مین ریٹائرڈ ہو گئے اور وہ نیشنل پارک ولایت چلے گئے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جنرل اسٹوارٹ — جو آخر میں ہندوستان کے جنگی لاٹ بھی ہو گئے تھے — چیف کمشنر بن کر انڈمان آئے۔ اسی کے عہد میں لارڈ میو صاحب بہادر کے حکم سے پورٹ بلیر کے قیدیوں کے لیے بھنڈار کا کھانا مقرر ہوا اور لارڈ میو کا بنایا ہوا وہ قافون بھی جاری ہوا، جس کے باعث پورٹ بلیر کی قید ہندوستان اور ولایت کے جیل خانوں سے بھی زیادہ سخت ہو گئی۔

لارڈ میو انڈمان میں
اسی سیزنٹنٹ کے عہد میں ۸ فروری ۱۹۴۷ء کو ہندستان کے گورنر جنرل لارڈ میو قتل کیے گئے۔ اس کی مختصر سی

تفصیل یہ کہ ۸ فروری ۱۹۴۷ء کو لارڈ میو سات بجے کے بعد چار انبوٹوں میں جزیرہ انڈمان آئے۔ لارڈ صاحب کے ساتھ صدایورپین مرد عورتیں تھیں، جو ان جزائر کی سیاحت کے لیے آئی تھیں۔ ۸ بجے کے بعد گورنر صاحب اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ پورٹ بلیر کے صدر مقام جزیرہ روس کی طرف چل پڑے۔ جب روس پہنچے تو انہیں ۲۱ توپوں کی سلامی دی گئی۔ جب سلامی دی جا رہی تھی تو جزیرہ کے گھاٹ پر ہزاروں مرد عورتیں، آزاد اور قیدی اس منظر کو دیکھنے کے لیے موجود تھے۔ لارڈ صاحب ٹاپو سے اترنے کے فوراً بعد روس کے بازار آئی لینڈ کی طرف متوجہ ہو گئے اور بازار، سکول، ہسپتال، قیدیوں کی بارکیں اور جنگی پلٹن کی بارکیں دیکھنے کے بعد انڈمان کے

چیف کشر کے بنگہ پر چلے گئے۔ وہاں کھانے پینے اور تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد گورابارک دیکھنے کے لیے چلے گئے۔ پھر اپنے اگنبوٹ کو دیکھتے ہوئے دیسپے گئے، جہاں بد معاش قیدیوں کو رکھا جاتا ہے، دیسپے کے ملاحظہ کے بعد جزیرہ چالم میں چلے گئے۔

جزیرہ چالم، روس اور دیسپے کے درمیان مونٹ ہریٹ قریب واقع ہے۔ یہاں ایک دفغانی آ رہ گھر بھی ہے۔ لارڈ صاحب نے یہاں سُرُخ کڑی کے ایک تختہ کو بہت پسند کیا۔ چالم کی سیر کرتے کرتے لارڈ صاحب کے دل میں آیا کہ مونٹ ہریٹ کو بھی ملاحظہ کرنا چاہیے۔ وقت نامناسب ہونے کی وجہ سے پرائیویٹ سیکرٹری او چیف کشر نے بڑے اصرار سے کہا کہ آج مونٹ ہریٹ نہیں جانا چاہیے لیکن لارڈ صاحب نہ مانے بلکہ صحیح الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ موت نے انہیں نہ ماننے دیا۔

لارڈ میو کا قتل

چالم سے سوار ہو کر جب ہوپ ٹون پہنچے، جو کہ ہریٹ کے زیریں علاقے میں آباد ہے، تو وہاں شیر علی ایک آفریدی قیدی چھری لیے ہوئے تبت دراز سے اس انتظار میں کھڑا تھا کہ کب یہاں سے کسی افسر کا گزر ہو اور وہ اسے چھری کا نشانہ بنا کر آتش انتقام کو سرد کرے۔ جب لارڈ صاحب کی کشتی ہوپ ٹون پہنچی تو وہ بھی اپنی چھری چھپے ہوئے ان کے ہمراہ ہو گیا۔ راستہ میں اس کا کوئی دلو نہ چلا اور لارڈ صاحب خیریت کے ساتھ پہاڑ پر پہنچ گئے۔ غروب آفتاب کا وقت قریب تھا۔ لارڈ میو صاحب نے وہاں بیٹھ کر سمندر میں غروب آفتاب کا نظارہ دیکھا اور کہا کہ ایسا خوبصورت منظر میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا تھا جب کافی اندھیرا چھا گیا تو مشعلوں کی روشنی میں نیچے اترنے لگے۔ اس وقت چاروں طرف پولیس کا سٹیج پہرہ تھا چیف کشر، پرائیویٹ سیکرٹری بدن سے بدن ملائے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ علاوہ ازیں دوسرے بیسیوں افسر بھی ان کے آگے پیچھے چل رہے تھے اور لارڈ صاحب خیریت سے ہوپ ٹون کے گھاٹ تک پہنچ گئے۔ جب گھاٹ کے قریب کھڑی ہوئی گاڑی کے نیچے پہنچے، تو چیف کشر اجازت لے کر کسی مزدور کی وجہ سے پیچھے چلے گئے۔ لارڈ صاحب

اور پرائیویٹ سیکرٹری خراماں خراماں جا رہے تھے۔ جب گاڑی کے قریب پہنچے تو شیر کی طرح کود کر اس نے لارڈ صاحب کو پھری سے دو ایسے کاری ضرب لگائے کہ وہ ہڑکھڑا کر سمندر میں جا گرے۔ اس کڑ بڑ میں تمام مشعلیں بھی گل ہو گئیں لیکن ایک دوسرے قیدی نے جرات سے کام لیتے ہوئے قاتل کو پکڑ لیا ورنہ وہ شاید دو پار اور کو بھی زخمی کرتا۔ لارڈ صاحب کو سمندر سے نکال اسی گاڑی پر لایا گیا، مشکل سے ایک دو باتیں ہی کرنے پائے تھے کہ راجی ملک عدم ہو گئے۔ قاتل سے پوچھا گیا کہ تم نے یہ اقدام کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا: ”خدا کے حکم سے“ پھر پوچھا گیا کہ کیا تمہارا کوئی اور بھی شریک ہے؟ خدا میرا شریک ہے۔ اس کا جواب تھا تحقیقات کے بعد بنکال ہائی کورٹ کے فیصلہ کے مطابق قاتل کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔

قاتل شیر علی ضلع پشاور کا افغان تھا۔ اس نے بتایا کہ ۱۸۶۹ء سے میرا علاقہ تھا کہ کسی بڑے انگریز افسر کو ماروں گا۔ اسی مقصد کے پیش نظر میں نے کئی سال سے یہ چھراتیا رکھ رکھا تھا۔ ۸ فروری ۱۸۶۲ء کو جب لارڈ صاحب آئے اور انہیں توپوں کی سلامی دی گئی تو میں نے چھری کو دوبارہ تیز کیا اور سارا دن تاک میں رہا کہ کب اس ٹاپو میں پہنچوں، جس میں لارڈ صاحب مجھے ملیں۔ مگر مجھے رخصت نہ ملی۔ شام کے وقت جب میں مایوس ہو گیا تو تقدیر لارڈ صاحب کو میرے گھر لے آئی۔ پہاڑ پر بھی لارڈ صاحب کے ساتھ گیا تھا اور ساتھ ہی واپس آیا لیکن کہیں موقع میسر نہ آ سکا۔ پھر میں گاڑی کی آڑ میں آکر چھپ گیا اور یہاں میری دلی مراد پوری ہو گئی۔

یہ شخص گونصیف الجتہ، پست قد اور بد صورت تھا لیکن بڑا شہ زور اور دلیر تھا۔ تختہ دار پر لٹکے وقت بالکل ہراساں نہ تھا بلکہ آواز بلند قیدیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ”بھائیو! میں نے تمہارے دشمن کو مار دیا ہے، تم گواہ ہو کہ میں مسلمان ہوں، پھر وہ کلمہ پڑھنے لگا اور کلمہ پڑھتے پڑھتے ہی روح نفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

اس ادنیٰ درجہ کے قیدی کے ہاتھوں لارڈ صاحب کا قتل قدرتِ الہی کا ایک نمونہ

تھا ورنہ کہاں گنگو تیلی اور کہاں راجہ بھوج۔ جب پیام اجل آپہنچا تو یہ صد ہا محافظ مسلح پولیس اور حفاظت کا دیگر ان گنت سامان کچھ کام نہ آیا۔ وہ جو چاہتا ہے سو کرتا ہے، اس کی قدرت میں کسی کو دخل نہیں۔

اس واقعہ سے ایک ماہ قبل ایک اور پشاور کی افغان نے چیت جسٹس نارمن کو اسی طرح کلکتہ میں چہرے سے قتل کر دیا تھا۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ ان وحشت ناک اور عبرت انگیز واقعات کے بعد انگریز پٹھانوں کے دشمن ہو جاتے لیکن میں نے دیکھا کہ صاحب لوگ پہلے کی نسبت انگریزوں کی دو چند خاطر داری کرنے لگ گئے اور پٹھانوں کے بجائے بنیسیب و ہابیوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنانے لگ گئے۔ آہ! مارنے والے سے ہر کوئی ڈرتا ہے اور غریب پر ہر کوئی شیر ہو جاتا ہے۔

ایشری پرشاد کی سازش | اس سے زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ لارڈ صاحب کے اس قتل کے بعد پٹ صاحب کیشنر پولیس کلکتہ اور

لارڈ ایشری پرشاد — ہمارے پرانے دوست جو ہم پر الزام لگا کر سارجنٹ سے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے — اور چند نامی گرامی پولیس افسر ہندوستان سے یہ عزم لے کر پورٹ بلیر پہنچے کہ ہم اس مقدمہ میں دہابیوں کو ضرور پھنسا دیں گے لیکن اللہ کے فضل سے اس وقت پورٹ بلیر میں جنرل اسٹوارٹ اور پراختہ والے ہوشیار اہل بیدار مغز افسر موجود تھے، جو ہمارے حالات، چال چلن، اس قتل کی کیفیت اور قاتل کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ اس وجہ سے اس مرتبہ ایشری پرشاد کو ناکام واپس لوٹنا پڑا ورنہ اس نے آتے ہی بھولے گواہ بنانا شروع کر دیئے۔ جنرل اسٹوارٹ کو جب معلوم ہوا تو اس نے کہا ہم ان دہابیوں سے بخوبی واقف ہیں لہذا جھوٹی شہادتوں پر مبنی ایسی ناجائز کارروائی اپنے علاقے میں ہم ہرگز ہرگز نہ ہونے دیں گے۔ اللہ رب العزت نے ہمیں اس ناگہانی آفت سے محفوظ رکھا اور اصل مجرم ہی سزا یاب ہوا۔

انگریزی زبان کی تعلیم | لارڈ میو کے قتل تک میں انگریزی زبان سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں ایک انگریزی خواں لام سروپ کی غیب

سے میں نے انگریزی زبان سیکھنی شروع کر دی تھی اور ایک سال کی محنت ہی سے مجھے لکھنے پڑھنے اور بولنے میں خوب مہارت ہو گئی تھی۔ فرصت کے لمحات میں لوگوں کو اردو، فارسی اور انگریزی بانیں سکھایا کرتا تھا یہی وجہ تھی کہ ان سے کثرت اختلاط کے باعث میری انگریزی کی استعداد بہت بڑھ گئی۔ اس وقت دہاں کاتبوں کی قلت تھی لہذا سرکاری ملازموں کو عرائض نویسی اور اپیل نویسی وغیرہ کی بھی ممانعت نہ تھی۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے بھی عرضی و اپیل نویسی کا سہل جاری رکھا اور جب انگریزی میں لکھنے کی استعداد پیدا ہو گئی تھی تب سے انگریزی میں لکھنا شروع کر دیا تھا، اس سے علمی استعداد میں ترقی کے علاوہ ہزاروں روپے کا مادی فائدہ بھی ہوا۔

چنانچہ انگریزوں کی معطلی اور عرائض نویسی سے سو روپیہ ماہوار بخوبی کما لیتا تھا۔ کالاپانی میں میرے علاوہ اور کوئی مسلمان انگریزی خواں نہ تھا، اس لیے میں نے اس علم کی بدولت مسلمانوں کے بعض بڑے بڑے اہم مقدمات میں ان کی بہت مدد کی، بڑی بڑی آفتیں اور مصیبتیں دور کرائیں اور بہت نفع پہنچایا، جسے مدت مدید اور عرصہ بعید تک فراموش نہ کیا جاسکے گا۔ میری انگریزی دانی کی وجہ سے جن کی پچانسی موقوف ہو گئی اور جان بچ گئی، وہ تو تازہ نیست اس احسان کو نہ بھولی گئے۔ یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ جس دن میری رہائی کا حکم پہنچ کر مشہور ہوا، اسی دن سے سرکاری ملازموں کے لیے عرائض نویسی کی قطعی طور پر ممانعت ہو گئی اور اب تو یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ اگر کوئی سرکاری ملازم بھول کر بھی عرضی لکھ دیتا تو اسے ملازمت سے فوراً برخاست کر دیا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی دیگر نوازشات کی طرح یہ اجازت بھی خاص میرے ہی لیے تھی۔

انگریزی سیکھ کر میں نے بڑے بڑے کتب خانوں کی سیر کی، ہر علم و ہنر کی صد ہا کتابوں کا مطالعہ کیا، دنیا کی کوئی زبان ایسی نہ ہو گی، جس کی صرف و نحو انگریزوں نے نہ لکھی ہو، کوئی ملک ایسا نہ ہو گا، جس کی تاریخ نہایت شرح و بسط کے ساتھ انگریزی میں نہ ہو۔ انگریزی زبان علوم فنون کا سرچشمہ ہے۔ جو یہ زبان نہیں جانتا وہ حالات دنیا سے بخوبی واقف نہیں ہو سکتا، اس زبان کے سوا کمانے کے لیے آج کوئی آلہ زور نہیں ہے۔

جس طرح یہ زبان دنیوی فوائد کے لیے نہایت مفید ہے، اسی طرح دین کے لیے مضر بلکہ تم قاتل ہے۔ کوئی جوان لڑکا جس نے پہلے قرآن و حدیث اور سلوک راہِ نبوت میں مہارت حاصل نہ کی ہو، وہ انگریزی زبان سیکھ کر مختلف علوم و فنون کا مطالعہ کرے تو پرلے درجے کا بے حد آزاد، بے دین، بے ادب اور منحہ ہو جائے گا۔ بلکہ ایسا بے دین اور منحہ ہو گا کہ پھر اس کا سنوٹا محال ہی نہیں ناممکن ہو گا۔

مغربی علوم کا ملحدانہ اثر | صرف انگریزی زبان کا سیکھنا مضر نہیں بلکہ مضر رساں بات یہ ہے کہ علوم و فنون کی ان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے جو انبیاء کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ خصوصاً جو لوگ اصولِ دین کی واقفیت نہیں رکھتے ان کے دل میں تو مغربی علوم و فنون کے مطالعہ سے تشکیک کے ایسے کانٹے پیدا ہو جاتے ہیں جو کبھی نہیں نکل سکتے۔ اس مرض یا دل کی موت کے باعث عبادت سے بھی بہت غافل ہو جاتے ہیں۔ گویا ظہری طور پر اسلام کے لاکھ دعوے کریں لیکن درحقیقت وہ اسلام سے منہ موڑ چکے ہوتے ہیں۔ میرا اپنا حال کچھ اس طرح کا ہو گیا کہ میری نماز متحد یک قلم چھوٹ گئی حالانکہ یہ بچپن سے میرا معمول تھا۔ رات کو معمول کے مطابق بیدار ہو جاتا لیکن دو بجے سے فجر تک چار پائی پر بیٹھا رہتا، ہمت نہ پڑتی کہ وضو کر کے نماز شروع کر دوں۔ اسی طرح جمعہ اور باجماعت نماز ادا کرنے میں بھی غفلت کا شکار ہولے لگا حتیٰ کہ قرآن و حدیث کے پڑھنے اور سننے کا بھی وہ شوق نہ رہا جو کبھی تھا۔ رمضان المبارک میں بھی قرآن مجید کی تلاوت بہت گراں گزرنے لگی۔ ایک وقت تھا کہ ہاتھ اٹھا کر گھنٹوں دعائیں مانگا کرتا تھا مگر اب کیفیت یہ ہو گئی کہ چار کلیمے بھی زبان سے نہ نکلتے کہ ہاتھ خود بخود نیچے گر جاتے۔ فرض نماز پنجگانہ ادا تو کرتا تھا مگر یہ کام مجھے پہاڑ سے بھی زیادہ سخت معلوم ہوتا۔ قریب تھا کہ میں فرض نماز روزہ کو بھی جواب دے دوں۔ ان کے عبث ہونے اور ترک کر دینے کے دلائل بھی شیطان نے مجھے سکھانے شروع کر دیئے تھے۔

قرآن مجید کے تین پارے مجھے حفظ تھے، ان میں سے آخری چند سورتیں یاد رہ گئیں باقی

سب بھول گیا۔ صد ہا پیش یا دھیس وہ بھی گویا دل سے ہی نے دھو ڈالیں۔ ان بے عقائد و اعمال سے میرے دل پر زنگ لگنا شروع ہو گیا حتیٰ کہ میرا دل مریض ہو گیا اور پھر تو نبوت میں جاریہ کہ دل پر نزع کی کیفیت طاری ہو گئی اور قریب تھا کہ دل مردہ ہو جائے اور اس پر طرہ یہ کہ اس حالت میں شیطان میرے دل میں ایسی ایسی دہو بات نقش کرتا، جن کی وجہ سے میں اپنی اس حالت کو سب سے بہتر جانتا اور سمجھتا تھا کہ جنت میں جانے کے لیے صرف کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کافی ہے اور یہ سب تکالیف شرعیہ بے فائدہ ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ کاہے کا ہے حق تعالیٰ کی طرف سے شیطان کی ان سازشوں کے متعلق بھی مجھے القاء کیا جاتا لیکن اس کے باوجود دل محدود اور دہریوں کے دلائل کی طرف متل ہو جاتا تھا الغرض مجھ میں اور کفر میں مرث چند انگشت کا فرق باقی رہ گیا تھا۔ یہ کیفیت ایک دو دن نہیں بلکہ عرصہ دراز تک رہی۔ شاید سابقہ اعمالِ صالحہ کا اثر تھا کہ مجھے اپنی اس ہلاکت آفریں کیفیت کا احساس ضرور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ احساس جب شدت اختیار کر جاتا تو میرے مزے سے بے اختیار دعائیں بھی نکلتی تھیں کہ اے آنکھ والے! مجھ اندھے کا ہاتھ کپڑے۔

آخر کار اللہ کی رحمت کا دریا جوش میں آیا اور میری توبہ کے سامان فراہم ہو گئے۔ ہوا یہ کہ کھانا دسمبر ۱۸۸۰ء میں ایک شدید ذہل کے عارضہ میں مبتلا ہو کر سخت بیمار پڑ گیا، جس کے باعث سب کھانا پینا بھی چھوٹ گیا۔ ڈیڑھ مہینے تک اس ذہل سے یروں پیپ جاری رہی، پانچ ہفتہ تک ہسپتال میں پڑا رہا، مرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہ گیا تھا، دوست آشنا سب مایوس ہو گئے اس حالت میں میں نے گڑ گڑا کر اللہ کے دروازے پر دستک دی اور اپنی حالت سے منتقل ہو کر سچی توبہ کی اور مہم کیا کہ اس بیماری سے شفا پاتے ہی نماز متجدد شروع کر دوں گا اور قرآن و حدیث کا مطالعہ بھی کیا کروں گا۔

مجھے اسی وقت سے قبولیت دعا کے آثار نظر آنے لگے، دل کی حالت پلٹ گئی اور اللہ کی رحمت کا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آنے لگا۔ بھوکا ہوا قرآن و حدیث اور ادعیہ ماثورہ یاد کرنے لگیں

نماز اور دعائیں بھی لذت و صلاوت محسوس ہونے لگی۔ اس کیفیت کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہ بیماری تو محض میری اصلاح اور تربیت کے لیے تھی ہسپتال سے واپس آکر پھر از سر نو قرآن و حدیث کا مطالعہ شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں میری حالت پہلے سے بھی اچھی ہو گئی۔

میں نے محسوس کیا کہ جس قرآن و حدیث کے پڑھنے سے طبیعت گہرائی اور ثقیل ہوتی تھی اور ایک دو آیت پڑھنا بھی محال اور دشوار ہوتا تھا، اب دن بھر بیٹھ کر پڑھتا ہوں اور اس سے طبیعت کو سرور اور دل کو لذت نصیب ہوتی ہے اور وہ دعا جس کے لیے ہاتھ اٹھانا محال تھا، اب گھنٹوں مانگنے سے بھی سیر نہیں ہوتا۔ اس کیفیت میں مجھ پر یہ عقیدہ بھی کھلا کہ عبادت اور اطاعت کی توفیق دینا بھی اللہ کا فضل ہے، جس کو چاہے دے، جس کو چاہے نہ دے۔

مجاہدین اور سرکار ہند ۱۸۶۳ء میں دہلیوں کی گرفتاری کی جو آگ تھا میری دشمنی

ہوئی تھی، وہ تیز ہوتی گئی اور ہر طلوع ہونے والا سورج اس کی تیزی کا پیام لے کر اُفق پر نمودار ہوتا ہمارے ہندو اور بعض مسلمان بھائی اس آگ کو بجھانے کے بجائے اس میں تیل اور تار پین ڈال کر بڑھاتے گئے۔ آخر کار ڈاکٹر ہنٹر نے اس جلی ہوئی آگ پر ہزاروں من دلائی بارود اور مٹی کا تیل ڈال دیا اور ہماری سرکار کو یہاں تک بھڑکایا کہ اس نے صادق پور پٹنہ کے دہلیوں کے ان مکانات کو نہ صرف پیرہیز میں کر دیا بلکہ زمین سے ان کی بنیادوں کو کھدوا کر دور پھینکوا دیا، جن میں اس قافلہ حریت کے لوگ ٹھہر کرتے تھے لیکن اس کے باوجود بھی سرکار کی آتش انتقام سرد نہ ہوئی۔

ڈاکٹر ہنٹر کی رسوائی کے زمانہ کتاب OUR INDIAN MUSLIMS

کی طرف اشارہ ہے، جس میں اس نے شرافت اور انسانیت کے تمام تقاضوں کو بلائے طاق رکھتے ہوئے مجاہدین کے خلاف بنایت بے سرو پا باتیں لکھیں، جن سے مشعل ہو کر انگریزوں نے مجاہدین کو آلام و مصائب کا اس قدر تختہ مشق بنایا کہ الامان والحیفہ اسے تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے مولانا عبدالرحیم مرحوم کی کتاب ”تذکرہ صادق“، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی ”ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک“

۱۸۶۲ء کے آخر تک پٹنہ اور بنگال میں بے گناہوں کی گرفتاری کا سلسلہ جاری رہا۔ امیر خاں سوداگر چرم اور

مولوی تبارک علی کے علاوہ دیگر بے شمار آدمی پٹنہ میں دھریے گئے۔ مولوی امیر الدین صاحب کو پٹنہ اور ایک بوڑھے شخص ابراہیم منڈل کو اسلام پور سے گرفتار کر دیا گیا اور اپنے سمولی اور پڑاٹنے گواہوں سے اپنی مرضی کے مطابق شہادت حاصل کر کے، ان بے پارے مخلوقوں کو سوتے کالا پانی روانہ کر دیا گیا۔

حکومت نے اپنا تمام فوج امیر خاں کی جائیداد فروخت کر کے حاصل کر لیا۔ اگرچہ اسے بھی حبس دوام کی سزا دی گئی تھی لیکن چار سال بعد مغت کا احسان کر کے اسے چھوڑ دیا اور اس غریب کی ضبط کی ہوئی جائیداد میں سے ایک پائی بھی اسے واپس نہ کی۔ ذرا غور فرمائیے کہ اگر امیر خاں اتنا مجاہد مجرم تھا جیسا کہ مقدمہ کی مثل ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے تو اسے چار برس بعد کیوں رہا کر دیا گیا؟ اور اگر وہ قصور وار نہیں تھا جیسا کہ اس کی رہائی سے معلوم ہوتا ہے، تو اتنے شدید اہتمام سے اس غریب کی جائیداد فروخت کرنے اور اسے پابند بنخیر و سلاسل کرنے کا کیا جواز تھا؟

مارچ ۱۸۶۲ء میں مولوی تبارک علی صاحب اور مولوی امیر الدین صاحب ہمارے پاس کالا پانی پہنچ گئے۔ قانون جدید کے جلدی ہونے کی وجہ سے ان بے چاروں کو ایک مدت تک سخت مشقت کرنا پڑی۔ پھر اللہ کا فضل ہوا اور مولوی تبارک علی صاحب اسٹیشن محرر اور مولوی

مولوی تبارک علی بن مولوی مبارک علی دونوں باپ بیٹے تحریک جہاد میں کام کرنے کے اعتبار سے شعلہ جوالہ سے کم نہ تھے۔ مولوی تبارک علی صاحب پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے جنگ اہلبیل میں مولانا عبد اللہ صاحب کے ساتھ شرکت کی اور ایک دستے کی کمان بھی کی۔ ۱۸۵۷ء میں آپ کو حبس دوام بیور وریٹے شور اور پہلی جائیداد کی سزا دی گئی اور ۱۸۶۳ء میں رہائی ہوئی۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۱۵۹۔

امیر الدین صاحب مقرر ہو گئے۔ دس برس قید کاٹنے کے بعد لاہور پرین کے حکم سے ہمارے ساتھ ہی رہا ہو گئے گویا قید کم تھے لیکن مشقت کی سختی کی وجہ سے گویا ہمارے برابر ہو گئے تھے۔

جب دس برس تک بھی وہابیوں کی قید و بند کا یہ سلسلہ بند نہ ہوا، تو میں اپنے بڑے اعمال کو یاد کر کے بہت کڑھا کرتا تھا کہ یہ آگ میرے گھر سے نکلی اور میری بد اعمالیوں کی وجہ سے دس برس تک تمام ہندوستان میں جلتی رہی اور ہزار ہا علماء و شرفاء اس مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ اسے کاش! مجھ سا مخوس اور بد بخت پیدا نہ ہوتا یا بچپن ہی میں مر جاتا تو مسلمانوں پر یہ آفت نہ ٹوٹی۔ چراز قوے یکے بیدار نشی کرد

نہ کہہ را منزلت ماند نہ مرا

مارچ ۱۸۵۲ء میں جس جہاز میں مولوی تبارک علی اور مولوی امیر الدین آئے تھے، اسی جہاز سے میاں عبدالغفار کی بیوی اور دو بچے بھی کلکتہ سرکار کالاپانی پہنچے۔ میاں عبدالغفار نے چیف کمشنر پورٹ بلیئر کے ذریعہ گورنمنٹ سے درخواست کی تھی کہ ان کے بیوی اور بچوں کو ہندوستان سے بلا دیا جائے۔ گورنمنٹ بنگال شکر یہ کی مستحق ہے کہ اس نے ایسے ”باغی“ کے بیوی بچوں کو اپنے خزانہ پر کالاپانی بھیج دیا۔

اتنے شدید بغض و غضب سے مسلسل دس برس تک وہابیوں کے دھڑاؤ و مڑ مڑ کر رفتار کر کے دریا برد کرنے سے انگریزی سرکار کا مقصد یہ تھا کہ ان فرزند ان توحید کا ہندوستان کی سرزمین سے قلع قمع کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انہیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ لیکن جسے خدا رکھے اسے کون چکھے میں نے کالاپانی سے واپس آکر دیکھا کہ جب میں ہندوستان سے نہایت ہوا تھا تو سارے پنجاب میں وہابی عقیدے کے دس مسلمان بھی نہ تھے لیکن اب دیکھتا ہوں کہ پنجاب کا کوئی شہر میاں عبدالغفار ولد ننگل صادق پور کے باشندے تھے۔ مولانا محمد اللہ یا مولانا عبدالرحیم کے علاوہ دیگر کے مذہب پر جوش و خروش اور مجلس لاریں تھے۔ ۳۵ برس کی عمر میں کالاپانی پہنچے اور ۵۳ برس کی عمر میں الٹی ہوئی ہوئی۔ ۱۹۱۲ء کے قریب راجپور کے عالم جاو داں ہو گئے۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ۱۳۳۲ء

شہر، قصبہ اور گاؤں ایسا نہیں جس میں چوتھائی حصہ وہابی نہ ہوں۔ جو امام محمد اسماعیل شہید رحمہ اللہ کے کے مقتدی ہیں اور یوں تا فیروما دیوانوں اور فرزانوں کی یہ جماعت ترقی کر رہی ہے۔ یورپ میں پاپاٹ فریق پر جب کتاب نازل ہوا تو کوئی عذاب، شکنجہ، سولی، پھانسی، جلا وطنی اور آگ ان کے راستے میں رکاوٹ نہ بنی۔ یہی کیفیت یہاں تھی۔ تجربہ سے ثابت ہے کہ کسی فرقہ کی ترقی کو روکنا اور اس پر تشدد کرنا اس کی ترقی اور جاہ و جلال کا سب سے مضبوط سبب ہوا کرتا ہے۔

دور کیوں جائیں تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ جب سکھ فرقہ پیدا ہوا اور اس نے بال و پیر نکالنے شروع کیے تو مغلوں نے ان کے نیت و نابود کرنے کے لیے کیا کیا نہ کیا مگر خدا کے بڑے علم کو کون گھٹا سکتا ہے۔ آخر وہی سکھ ہیں جنہوں نے پشتاور سے دہلی تک مغلوں کی سلطنت پھینکی اور سو برس تک جلال و اقبال سے حکومت کی۔ ادھر دکن میں مرہٹوں کا یہی حال تھا جتنا روکا اتنا ہی بڑھتے گئے۔ خدا تعالیٰ کی حکمت بالغہ میں دست اندازی کرنا، اپنے لیے ہلاکت کے سامان فراہم کرنے کے مترادف ہے۔

اولاد

۱۲ اپریل ۱۸۵۲ء کو میری بڑی لڑکی پیدا ہوئی، اس کا حقیقہ بڑی دھوم دھام سے کیا گیا۔ مولوی امیر الدین صاحب اور مولوی تبارک علی صاحب، جن کو یہاں پہنچے ہوئے صرف پندرہ روز ہوئے تھے، انہوں نے بھی اس دعوت حقیقہ میں شرکت فرمائی۔ اس کے بعد میری دوسری لڑکی پیدا ہوئی۔ محبت کے مارے میں نے اس کا نام اپنی ہندوستان والی لڑکی کے نام پر رکھا۔ اس کا حقیقہ بھی پہلے کی طرح بڑی دھوم دھام سے کیا گیا۔ اس کے بعد قیسرا بچہ ۲۶ نومبر ۱۸۵۲ء کو پیدا ہوا۔ اس کا نام بھی میں نے اپنے ہندوستان کے لڑکے کے نام پر محمد صادق رکھا۔ اس لڑکی کی پیدائش کے وقت ایک عجیب سرالشی ظاہر ہوا، جو غالباً میری تسلی کے لیے تھا وہ یہ کہ جس دن یہ لڑکا کالاپانی میں پیدا ہوا، اسی دن بلکہ اسی وقت میرا بڑا لڑکا محمد صادق پانی پت

بہ امام محمد اسماعیل شہید کے مفصل سوانح حیات کے لیے ملاحظہ فرمائیے ”تذکرہ شہید“ از محمد خالد سیف

میں فوت ہوا تھا۔ جب اس کی وفات کی خبر پہنچی، تو میں نے اس کا نعم البدل اور اس کا ہم نام اپنے پاس پیکر منبر و شکر کیا اور اس کی والدہ کو بھی اس کے نعم البدل اور ہم نام مل جانے کی خبر لکھ بھیجی۔

جب میں نے انگریزی سیکھی تو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب OUR INDIAN MUSLIMANS دیکھنے کا برا شوق پیدا ہوا، تو بڑی شکل سے سات پوچے میں کلکتہ سے ایک نسخہ منگوایا۔ یہ کتاب کا دور سراڈیشن تھا۔ جب میں نے کتاب کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ ایک مقام پر ڈاکٹر ہنٹر نے بڑی لمبی چوڑی تنید باندھ کر لکھا اگر کارنے ترجمہ خسرانہ سے کام لیتے ہوئے وہابیوں کو کبھی کالا پانی سے رہا بھی کر دیا تو وہ اپنی اس رہائی کو اللہ جل جلالہ کی جانب سے سمجھتے ہوئے جب واپس ہندوستان آئیں گے، تو انگریزی حکومت کے لیے پہلے کی نسبت زیادہ تخریب و بربادی کا موجب ہوں گے۔ مرکز کا مقصد اور غرض دیکھ کر ہم تو پہلے ہی رہائی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ یہ زہر آمیز مضمون پڑھ کر رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔

جب گورنمنٹ ہند نے ان دائم الجلس قیدیوں کی رہائی کا حکم جاری کیا جنہیں قید ہوئے بیس سال گزر چکے تھے، تو ہمارے کیس کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ اس سب سے جڑھ کر ناامیدی اس وقت ہوئی جب ۱۸۸۱ء میں خود ڈاکٹر ہنٹر گورنر جنرل ہند کے مصاحب مقرر ہوئے۔ ہم نے خیال کیا کہ جس شخص کی کتاب کو پڑھ کر دانا سے دانا انگریز گمراہ ہو جاتا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارا دشمن ہو جاتا ہے تو محکمہ گورنری میں اس کی موجودگی کیا کیا کل نہ کھائے گی؟

لیکن بایں ہر غیبی طور پر دل میں الہام ہوا کہ ہم جلد رہا ہو کر ہندوستان جا رہے ہیں؛ چنانچہ میں نے مولوی انوار اللہ اسلام اور حافظ محمد اکبر

رہائی کی امیدیں

۱۸۸۱ء میں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۸۱ء اور دوسرا ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا تھا۔

پانی پی کر خلوط بھی لکھ دیئے تھے کہ میں جلد ہندوستان آیا چاہتا ہوں۔ جون ۱۸۸۱ء میں خاکسار کا پورٹ بلیر کے جنوبی حصہ ابرڈین میں تبدیل ہو گیا اور وہاں میں اپنے پرانے آقا اور شاگرد میر پرائیڈ صاحب فری کشن کا میرنشی مقرر ہوا اور رہائی و روانگی کی تاریخ تک اسی عہدہ پر متعین رہا۔

پرائیڈ صاحب نے میری اعانت سے پورٹ بلیر کے لیے آئین کی کتاب بھی لکھی جو گورنمنٹ کی منظوری کے بعد مشترک کی گئی، اس کا اردو ترجمہ بھی میں نے کیا تھا اور وہ بھی چھپ چکا ہے اسی صاحب نے میری چودہ برس کی کارگزاریوں اور جانفشانیوں پر نظر تو جب کرتے ہوئے میری رہائی کے لیے گورنمنٹ ہند کو بڑی دھوم دھام سے ایک رپورٹ بھیجی۔ اس رپورٹ پر رہائی تو کیا ہوئی البتہ سیکرٹری ہوم ڈیپارٹمنٹ اس قدر ناراض ہوئے کہ تازہ سبست رہائی ناممکن ہوئی اور دوبارہ کسی افسر کے لیے میری رہائی کی رپورٹ کرنے کا حوصلہ ہی باقی نہ رہا۔ ۱۸۸۰ء کے آخر میں مولانا عبدالرحیم کے صاحبزادے مولانا عبدالفتاح صاحب اپنے والد ماجد کی طاقات کے لیے پورٹ بلیر پہنچے اور کوئی سال بھر رہنے کے بعد واپس چلے گئے۔ مولانا عبدالرحیم صاحب نے اپنے بیٹے کو ایک درخواست لکھ کر دی، جو ان کی بیوی کی طرف سے لکھی گئی تھی۔ یہ درخواست اپریل ۱۸۸۲ء میں گورنر جنرل ہند کے نام ارسال کی گئی۔ درخواست میں بیان کیا گیا تھا کہ:-

”میرے شوہر پر کوئی بھاری قصور ثابت نہ ہو سکا تھا۔ اس لیے جب مقدمہ سیشن جج اور چیف کورٹ میں پیش ہوا تو کہا گیا تھا کہ عبدالرحیم نے اگر نیک سنی کا ثبوت دیا تو مقدمہ پرنسپل رٹائی کی جائے گی مگر اب تو ۱۲ کھائے ۱۸ برس ہو چکے ہیں میں نے اس کی بدائی میں بہت تکلیف اٹھائی ہے اور وہ بھی بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ لہذا اس کا کوئی چاہیے کہ اس کے مقدمہ کی مثل ملاحظہ کرنے کے بعد اسے رہائی بخش دے۔“

اس درخواست کے ملاحظہ کرنے کے بعد لاڈل پرنس نے مثل مقدمہ کو طلب کیا نیز پنجاب اور بنگال کی گورنمنٹ سے رائے طلب کی کہ اگر ان وہابیوں کو رہا کر دیا جائے تو اس میں کچھ قباحت تو

نہیں، بلکہ حکام کی آراء کے انتظار کے لیے مقدمہ کو آئندہ سال کے آغاز تک ملتوی کر دیا گیا۔ یہ درخواست صرف مولانا عبدالرحیم صاحب کے لیے تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا قصور بھی نہ تھا۔ انہیں تو صرف فرضی مفسدوں کی اولاد ہونے کے جرم کی پاداش میں گرفتار کیا گیا تھا اس لیے جس صورت ان کی رہائی کا انتظار تھا۔ اس ذریعہ سے اپنی رہائی کا تو گمان بھی نہ تھا۔ خصوصاً اس صورت حال میں جب کہ ان دونوں بنگال گورنمنٹ کے صاحب لوگ پورٹ بلیئر میں جمع ہو گئے تھے اور ہم سے نہایت تعصب سے پیش آتے تھے۔

۱۸۸۱ء میں پیری اور ضعف کی وجہ سے مولانا احمد اللہ صاحب کی حالت زیادہ ہی قابل رحم ہو گئی تھی۔ اس وقت آپ کی عمر ۸۰ سال کے قریب تھی۔ انہوں نے اپنی حالت زار کے پیش نظر کلکتہ میں مقیم اپنے صاحبزادے مولانا محمد یحییٰ صاحب کو بلانا چاہا اور پورٹ بلیئر کے قاعدہ عام کے مطابق یہ طاقت جائز اور درست تھی اور سینکڑوں بیٹے اپنے اپنے باپ سے آکر مل گئے تھے مگر صرف اس وجہ سے کہ احمد اللہ وہابی ہے، ان کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔

اس اثنا میں میں نے بھی بطور امتحان ایک درخواست بھیجی کہ محمد رشید میرے حقیقی برادر زادہ کو میرے پاس پورٹ بلیئر آنے کی اجازت دی جائے۔ یہ درخواست بھی سراسر منظور کی قابل تھی مگر صرف اس وجہ سے کہ وہابی ہے، درخواست مسترد کر دی گئی۔

جب مولانا احمد اللہ صاحب نہایت کمزور اور چپہراغ
مولانا احمد اللہ کا انتقال
سحری ہو گئے تو مولانا عبدالرحیم صاحب نے ان کی حالت بیان کر کے حکام کو لکھا کہ میں ان کا قریبی رشتہ دار ہوں۔ دیر میں ان کی خدمت کرنے والا کوئی نہیں لہذا انہیں ابرڈین میں میرے گھر رہنے کی اجازت دی جائے۔ یہ درخواست جس کے پڑھنے سے سنگ دل سے سنگ دل انسان کا دل بھی موم ہو سکتا تھا، مجھ سے اس وجہ سے مسترد کر دی گئی کہ احمد اللہ اور عبدالرحیم دونوں وہابی ہیں، ان کے ساتھ یہ رعایت نہیں ہو سکتی۔

جب مولانا موصوف کی حالت نہایت تپلی ہو گئی اور انگریزوں کا تعصب شدت اختیار

کرنا گیا تو مولانا عبدالرحیم نے یہ درخواست کی کہ انہیں رات کو دیو پڑیں مولانا کے پاس رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ بڑی رد و کد اور کجٹ کے بعد یہ درخواست منظور ہوئی اور مولانا عبدالرحیم کو ۲۰ نومبر کو شام کے وقت ایک تحریری پاس ملا اور اسی رات ۲۱ نومبر ۱۸۸۱ء (۲۸ محرم ۱۲۹۵ھ) شب و دو شنبہ کو ایک بکے مولانا موصوف کی روح اس سیم قید در قید نو چھوڑ کر فردوسی بریں پرواز کر گئی۔ **تَوَدَّ اللَّهُ مَرْقَدًا وَبَرَدًا مَضْبَعًا۔**

مولانا کی وفات کے وقت ان کا ایک ملازم ان کے پاس ہسپتال میں موجود تھا۔ مولانا کی روز سے بے ہوشی کے عالم میں تھے لیکن وفات کے وقت آپ نے **اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ** الملک "آخری کلمہ زبان سے ادا فرمایا اور اپنے اللہ کو پیار سے ہو گئے۔

۲۱ تاریخ کو آٹھ بجے صبح میں ابرڈین میں آپ کی وفات کی اطلاع ہوئی تو ہم سب بہت سے احباب کے ساتھ زنجے دیپر پہنچ گئے۔ میں چونکہ ضلع کچہری میں منشی تھا اس لیے ضلعدار کی اجازت کے بغیر نہیں جاسکتا تھا۔ حکام کے تعصب کی وجہ سے اجازت کا ملنا بھی محال تھا لیکن آپ کی تجہیز و تکفین میں شرکت کرنا بھی ضروری تھا۔ اس لیے میں اللہ پر توکل کرتے ہوئے اجازت کے بغیر ہی دیپر چلا گیا اور ایک درخواست بھیج دی کہ میں مولانا احمد اللہ صاحب کی تجہیز و تکفین میں شرکت کے لیے دیپر جا رہا ہوں لہذا میری آج کی غیر عارضی کو معاف فرما دیا جائے۔

دیپر پہنچ کر ہم نے انگریزی حکام سے یہ درخواست بھی کر دی کہ میں اجازت بخشاںے کے مولانا احمد اللہ صاحب کی لاش کو ابرڈین لے جا کر ان کے حقیقی بھائی مولانا یحییٰ علی صاحب کی قبر کے متصل دفن کر دیں یہ درخواست بھی مسترد کر دی گئی تو مجبوراً غسل اور نماز جنازہ کے بعد ڈنڈا اس پینٹ کے گور غریباں میں جو کہ دیپر سے تھوڑی دور ہے انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔

اپنے ان سب سارے تجربات سے یہ بھی سیکھا کہ جب کبھی میں نے کسی ماکم یا افسر پر زبرد کیا اور خدا کی طرف توجہ نہ دی تو میرے اللہ نے اسی خیالی سعادوں کے ہاتھ سے مجھے ایذا پہنچانے کا بندوبست کر دیا مگر جب میں نے اس خیال سے تائب ہو کر، اس ذات وحدہ لا شریک کی

طرف رجوع کیا تو اس نے میری مدد فرمائی اور آفت سے نجات بخشی اور جو لوگ پہلے سے میرے دشمن تھے اور جن سے میں ڈرتا تھا، انہی کو میری مدد اور پشت پناہی کے لیے کھڑا کر دیا۔

خدا تعالیٰ کو کیسی طرح بھی منظور نہیں ہے کہ میں اس کی طرف سے غافل ہو کر غیر اللہ کی طرف رجوع کروں۔ وہ رب العزت ہمیشہ مار مار کر اور تنبیہ کر کے مجھے شرک سے بچاتا، اور اپنی طرف رجوع کرتا رہا ہے۔

ستمبر ۱۸۸۲ء میں میری بیوی نے پانی پت سے خط لکھا کہ میری بڑی لڑکی جہان برگئی ہے تھانہ رانی کی امید پر آج تک اس کی شادی کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ تمہاری جلد رانی کی اب بظاہر کوئی شکل نظر نہیں آتی اگر آپ اجازت دیں تو کسی جگہ اس کی شادی کا بندوبست کر دیا جائے نیز اس کاہنیر کے لیے آپ کچھ ضروری خرچ بھی بھیج دیں۔ میں نے حکم رانی کی تاریخ سے اڑھائی ماہ قبل ۱۳ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو زید اور پارچہ جات کے علاوہ تین سو روپے نقد بھی پانی پت بھیج دیئے اور اپنی بیوی کو لکھا کہ تم کسی دیندار مسلمان سے اس لڑکی کی شادی کر دو۔

جب میرا بھیجا ہوا مال اسباب اور خط پانی پت پہنچا تو اس کی شادی میں میرے شامل نہ ہونے کی وجہ سے خوشی کے بجائے ان لوگوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ میری بیوی اور لڑکی تو رو رو کر یہ دعائیں کرتی تھیں کہ اے قادر کریم! اس کو بھی اس شادی میں شریک کر۔

رانی | اس وقت تک میری رانی کا بظاہر کوئی سامان نہ تھا مگر اس مستجاب الدعوات نے اسی دم ان کی فریاد کو شرف قبولیت سے نوازا۔ ۳۰ دسمبر ۱۸۸۲ء کو کسی درخواست

سعی دکاوش یا سفارش کے بغیر میری رانی ہو گئی اور مجھ سے بھی پہلے پانی پت میری بیوی کو اس کی اطلاع دی گئی۔ اب جو میری رانی کا زمانہ قریب آیا تو ہر وقت اپنی رانی کا غم ظہور ہوتا تھا اور اس ملک کے تحفے تحائف جمع کر کے چلنے کیلئے بالکل تیار ہو گیا۔ اگرچہ بہت سے لوگ میرے مقدور اور حکم گورنری کی کارگزاری کو دیکھ کر میری اس تیاری پر تعجب کا اظہار کیا کرتے تھے۔ آخر کار ۲۲ جنوری ۱۸۸۳ء بروز دو شنبہ ہمارا فی انگلوٹ یہ حکم لے کر پہنچا کہ رانی کیس میں مجرم بخاوت جس قدر

آدمی قید ہیں سب کو رہا کر کے ہندوستان روانہ کر دیا جائے ان کی لوکل گورنمنٹ ان کی سکونت کے لیے معقول بندوبست کرے گی۔ جب یہ حکم دہلی پہنچا تو میرے علاوہ مولانا عبدالرحیم صاحب میاں عبد الغفار، مولانا تبارک علی، مولانا امیر الدین اور میاں مسود گل اس مقدمہ کے چھ آدمی دہلی موجود تھے۔ چنانچہ سب کی رانی ہو گئی۔

اخبارات کے ذریعے ہندوستان میں جب یہ خبر مشہور ہوئی تو اسلامی حیثیت کے پیش نظر مسلمانوں کی تمام اسلامی انجمنوں اور مجلسوں نے لارڈ پرین کے اس ترجم خسرانہ کا بذریعہ میموریل شکریہ ادا کیا۔ جیسے ہماری گرفتاری پر تمام ہندوستان میں کھرام مچ گیا تھا، ویسے ہی اب گھر گھر خوشی اور شکرانہ کی مجلسیں منعقد ہوئیں اور لارڈ پرین کی مداحی اور شکر گزاری سے ہماری زبان اور قلم کبھی قاصر نہ رہے گا۔ جس کی اول العزم اور ترجمانہ پالیسی کے باعث ہمیں پھر سے ہندوستان دیکھنا نصیب ہوا۔

اسی عرصہ میں میرے ایک پُرانے شاگرد کپتان ٹیل نے جو میری رانی کے وقت کیمپ انبالہ میں مجسٹریٹ تھے، میری رانی کی خبر سن کر مجھے لکھا کہ اگر تم میرے پاس رہنا قبول کر دو تو میں گورنمنٹ سے اجازت لے کر تمہیں اپنے پاس بلالیتا ہوں میں نے اس پیام کو تائید بھی کر دیا اور قبول کر لیا انہوں نے گورنمنٹ پنجاب سے اجازت حاصل کر کے اور خود میرے منامن بن کر ننگرانی کی تمام شرائط کو موقوف کر دیا۔

روانگی کے انتظامات

جب میری رانی کا حکم پورٹ بمبر پہنچا تو میری بیوی نے جو کہ صبر و دوام میں گرفتار تھی، اسے ابھی قید ہونے سے فضا چوڑ

برس ہوئے تھے اس لیے اسی انگوٹ میں گورنمنٹ کو اطلاع دی گئی کہ جب تک جو جعفر کی بیوی رہا نہ ہوگی، وہ ہندوستان نہیں جاسکتا اور اپنی رانی کا حکم پاس ہے ہی نہیں نے بھی گورنمنٹ پنجاب کو لکھا کہ یہاں میرا نہایت عمدہ گھر موجود ہے، میں سو دپیہا ہوار کا ملازم ہوں۔ ہندوستان میں میرا گھر بہت اور نہ در اور غالباً یہاں آنے پر حکام پنجاب بھی مجھے ناجائز طور پر تنگ کیا کریں گے اور

مجھے قیدی سمجھ کر کوئی ملازمت بھی نہ دیں گے، اس وجہ سے مجھے امید ہے کہ آپ اجازت دیں گے کہ میں وقتاً فوقتاً ہندوستان جا کر اپنے بیوی بچوں کو دیکھ آیا کروں، اگرچہ چیف کمشنر صاحب نے پورٹ بلیر میں میری ٹیکس چلنی اور عمدہ کارگزاری کو دیکھ کر سفارش کر دی تھی کہ محمد جعفر کے لیے خاص طور پر سرکاری وظیفہ مقرر کیا جائے تاکہ ہندوستان میں اس کی گزر بسر ہو سکے لیکن گورنمنٹ پنجاب نے میری اس درخواست کو نامنکور کر کے جبراً مجھے اور میرے بیوی بچوں کو ہندوستان بلایا اور ساتھ ہی یہ وعدہ کیا کہ تمہیں پنجاب میں ملازمت دی جائے گی۔

۳ مارچ ۱۸۸۳ء کو مولانا عبدالرحیم، میاں عبد الغفار، مولانا امیر الدین اور مولانا تبارک علی سونے ہندوستان روانہ ہوئے اور بحیرہ عرب تمام اپنے اپنے گھر پہنچ گئے۔ اس کے بعد ۲۸ اپریل ۱۸۸۳ء کو میاں مسعود بھی چلے گئے اور فقط میں اکیلا اپنی بیوی کی رہائی کے حکم کے انتظار میں رہ گیا۔ یکم مئی ۱۸۸۳ء کو میری بیوی کی رہائی کا حکم بھی آگیا مگر اس وقت میری بیوی چھ ماہ سے اسید سے تھی اور سمندر میں طوفانی موسم شروع ہو چکا تھا اس لیے میں نے نومبر ۱۸۸۳ء (محرم ۱۳۰۳ھ) تک پورٹ بلیر میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی۔ اس مدت میں میں نے اپنے گھر کا سامان فروخت کرنا شروع کر دیا اور اوسنے پوسٹ پیس دیا۔

تعصب کی انتہا | التبر ۱۳۰۳ء میں میں نے چاہا کہ اپنے چونی گھر کو مسجد بن کر بنائے بسیل اللہ وقت کر دوں۔ سب مسلمان جو بغیر مسجد کے تکلیف اٹھاتے تھے اس خواہش سے بہت خوش ہوئے مگر ڈپٹی کمشنر ہرج صاحب نے اذراہ تعصب یہ رپورٹ بھیج دی کہ یہ شخص دیوانی ہے اور مسجد بھی دہائیوں کے قبضہ میں رہے گی لہذا مسجد بنانے کی اجازت نہ دی جائے اس طرح وہی تعصب و اہمیت اس کا رخنہ نہیں مانع ہوا۔

انڈمان کا انتظام حکومت | جیسا کہ میں نے پورٹ بلیر میں اپنی آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے یہاں کے جغرافیہ اور قدیم باشندگان کے حالات

بیان کیے تھے۔ اسی طرح اس مقام پر پورٹ بلیر سے روانگی کے ذکر سے قبل ساکنان پورٹ بلیر کے قوانین اور طرز زندگی پر کچھ روشنی ڈال کر اس جزیرے سے رخت سفر باندھتا ہوں۔

یہ جزیرہ دوسرے جزیروں کی طرح گورنمنٹ کی مستقل مملکت ہے چیف کمشنر صاحب کو اختیار ہے جو قانون چاہے بنائے، جسے چاہے دیوانی و فوجداری اختیارات کا قلم دان سونپ دے۔ چیف کمشنر ہی یہاں کا سیشن جج بھی ہے اور اس کا حکم حکم مطلق ہے اس کے بعد اپیل نہیں ہو سکتی۔ صرف مقدمات پچانسی کے لیے گورنر جنرل کے اجلاس کونسل کی اجازت ضروری ہے۔ دیگر سب امور میں خواہ دیوانی ہوں یا فوجداری چیف کمشنر ہی ہائی کورٹ کے فرائض سر انجام دیتا ہے چیف کمشنر کی اجازت کے بغیر یہاں سے کوئی مسافر، جہاز یا مال و اسباب نہیں گزر سکتا۔ چیف کمشنر صدر مقام روس میں رہتا ہے اور اس کی تنخواہ تین ہزار روپیہ نا ہوا رہے۔ یہ جزیرہ جنوبی و شمالی دو ضلعوں میں تقسیم ہے۔ جنوبی ضلع کا صدر مقام ابرڈین ہے اور شمالی ضلع کا چارم۔ دونوں ضلعداروں کے ماتحت دوسرے بہت سے اسٹنٹ اور کمشنر کام کرتے ہیں ۱۸۸۳ء کی ابتداء سے لے کر اب تک اس سسٹم کے دستور العمل اور قواعد میں بے شمار دفعہ تبدیلی ہوئی ہے اور ہمیشہ زیادہ سے زیادہ سختی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور کیفیت یہ ہے کہ آمد برآمد براہ مزید کرد

قیدیوں کے لیے قوانین | ہر سال دو ہزار کے قریب قیدی ہندوستان سے قید کر کے یہاں بھیجے جاتے ہیں، اس وقت یہاں چودہ ہزار کے قریب قیدی موجود ہیں۔ جہاز سے اتر کر جب ایک مہینہ ہو جاتا ہے تو ان کی بیڑیاں کا دی جاتی ہیں۔ یہاں جیل خانے نہیں بنائے گئے بلکہ قیدیوں کو بارکوں میں قیدی افسروں کے ماتحت رکھا جاتا ہے۔ ہندوستان کی جلیوں کی طرح یہاں بھی قیدیوں سے دن بھر سخت مشقت لی جاتی ہے، دو وقت کھانا دیا جاتا ہے اور رات کو بارکوں میں ہی سلا یا جاتا ہے۔ بارکوں کی حفاظت کے لیے قیدی افسروں کے علاوہ اور کوئی پولیس یا جگہ ملٹن نہیں ہوتی الغرض قیدیوں کی حفاظت

نکرانی اور تسمیم کار و غیرہ سب قیدی افسروں کے سپرد ہے، جو سر پر لال دودھ اور گٹے میں چڑا کر اس
ڈال کر رہنے دیتے اور اپنے اپنے مارنے کے مطابق حکومت سے تنخواہ بھی وصول کرتے ہیں۔

نئے قیدیوں کو بھی بشرط ایک مہینے میں چار برس کے بعد تنخواہ ملنے لگتی ہے۔ تنخواہ پانے کے
بعد یہ قیدی بھی پٹے والے افسر مقرر ہو جاتے ہیں۔ دس برس تک چلن رہنے کے بعد ہر قیدی ٹکٹ
کا مستحق ہو جاتا ہے۔ ٹکٹ پانے والا قیدی بارگ سے آزاد ہو جاتا ہے اور اسے اجازت ہوتی
ہے کہ جس شہر یا بستی میں چاہے سکونت اختیار کرے اور جو چاہے کسب معاش کا طریقہ اختیار
کر کے کھائے اور کھائے۔

قیدیوں کی پچاس ساٹھ کے قریب بستیاں بھی موجود ہیں، ان میں نمبردار، پٹواری اور
چوکیدار سب قیدی ہیں۔ جو قیدی کھیتی باڑی کرنا چاہیں انہیں گاؤں میں سرکار کی طرف سے پندرہ
ایکے زمین مفت مل جاتی ہے، تین برس تک محصول بھی معاف رہتا ہے بلکہ کبھی کبھی حکومت
نقدی، سیل اور غوراک کی صورت میں بھی مدد کرتی رہتی ہے۔ جو لوگ ملوائی، نانوائی یا نانائی وغیرہ کے
طور پر کام کرنے کے لیے ٹکٹ حاصل کرتے ہیں، انہیں کبھی کبھی حکومت کی طرف سے امداد مل جاتی
ہے۔ اس قسم کے ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد قیدی آزاد ہوتا ہے کہ جو چاہے کرے۔

قیدی عورتیں ایک الگ جزیرہ میں لیڈی افسروں کے ماتحت بارکوں میں رکھی جاتی ہیں۔
جب تک بارک میں رہتی ہیں، زنا کاری کی پوری پوری روک تھام کی جاتی ہے۔ عورتوں کو بھی بارکوں
میں پسائی اور ملوائی وغیرہ کی مشقت کرنا پڑتی ہے۔ عورتوں کو پانچ سال بعد آزادی کا ٹکٹ ملے دیا
جاتا ہے لیکن جو عورتیں جب تک شادی نہ کر لیں، انہیں ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد بھی بارک
سے جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔

پانچ برس کی مدت گزرنے کے بعد عورت کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ جس مرد سے چاہے
شادی کر لے لیکن مردوں میں سے صرف انہیں شادی کی اجازت حاصل ہوتی ہے جو ٹکٹ حاصل
کر چکے ہوں۔ جو آدمی شادی کرنا چاہے وہ عورتوں کے جزیرہ میں جا کر کسی عورت کو پسند کر لیتا ہے

اور اسے بہ دے، اگر شادی پر راضی کر لیتا ہے اور جب دونوں راضی ہو جاتے ہیں، تو انہیں
اپنی رضا مندی اور رغبت، رفاقت سے مل کر رہنے کا اترانا مار لکھ کر چھپ مشر کو دینا پڑتا ہے۔
اس کے بعد بیوی اپنے نانا، نند کے گھر چلی آتی ہے۔

ٹکٹ پانے والے قیدی ملک سے اپنے بیوی بچوں کو بھی بلا سکتے ہیں۔ جب کوئی قیدی بیوی سے
ایک نیک حال چلن رہنے تو اس کی رہائی بھی ہو جاتی ہے اور اسے اختیار ہوتا ہے، وہ اب
یہاں سے، پاتا ہے اپنے وطن مانوف چلا جائے۔ ٹکٹ حاصل کر لے، قیدیوں کو اختیار
ہوتا ہے کہ حلال کھائی سے خواہ لاکھوں روپے جمع کر لیں لیکن ملک سے تین۔ اسی پاس رہنے یا
کسی دوسرے کے پاس جمع کرانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ بارگ کے زیر میں قیدی ایک سال
یا تین مہینے بعد ایک خط اپنے گھر بھیج سکتے ہیں اور ایک خط اپنے وطن سے وصول کر سکتے ہیں،
لیکن ٹکٹ والوں کو اجازت ہوتی ہے کہ زمین میں ایک نہا جین سکتے ہیں اور ایک خط و رسوں کر
سکتے ہیں۔

مختلف زبانیں

پورٹ پیر ایک ایسی جگہ ہے جہاں چینی، برتھی، ملائی، سنگلی، جنگلی
نکو باری، کشمیری، پشتونی، ایرانی، عربی، حبشی، پارسی، پرتگیزی،
امریکی، انگریز، ڈچ اور فرینچ اور اسی طرح ہندوستان کے تمام ضلعوں اور شہروں کے مثلاً
بھونیا، نیپالی، پنجابی، سندھی، گجراتی، اہل برج، آسامی، تہلی، ہندو، بلخندھی، اوڈیا، تلنگی، مرچھے
کرناٹکی، مدراسی، ملیام، گوند، بھیل، بنگالی، گول اور سنگھال وغیرہ ہر قسم کے لوگ موجود ہیں
جب یہ لوگ آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو اپنی اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہیں لیکن بازار اور
پکھڑیوں کی زبان بھی یہاں بھی ہندوستانی ہے۔ ہر ملک کا باشندہ یہاں آکر خود بخود ہندوستانی
زبان سیکھ جاتا ہے کیونکہ اس زبان کے بغیر یہاں گزارا ممکن نہیں۔ میرے خیال میں وہ سب
زمین پر اور کوئی ایسا خطہ نہ ہوگا جہاں اس قدر کثیر قومیں آباد ہوں۔ جہاں پالیس کے قریب
مختلف قوموں کے افراد رہ رہے ہیں۔ شان الہی سے یہاں ایک ایسا سبل اور مجمع لگا رہتا ہے

کہ وہ زمین پر کسی دوسری جگہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ جب کوئی جنگالی مرد اور مدراسی عورت یا بھوٹیا مرد اور پنجابی عورت علیٰ هذا التیاس دو مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والا جوڑا شادی کرتا ہے تو نوازاہ اپنی بیوی اور بیوی اپنے خاندان کی زبان سے نا آشنا ہوتی ہے۔ تکرار اور لڑائی کے وقت جب وہ ایک دوسرے کو اپنی مادری زبان میں گالی دیتے ہیں اور نزاع ثانی ہوتی نہیں جھٹکا، تو ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ تقریب شادی وغیرہ پر ملک ملک کی عورتیں جمع ہو کر اپنی اپنی بون میں گالی، اپنی وضع پر ناپاکی کودتی اور اپنے اپنے ملک و لباس زیب تن کرتی ہیں، تو یہ منظر بھی دید کے قابل ہوتا ہے۔

مختلف اقوام اور ان کی معاشرت | یہاں قوم کی پابندی، جو ہندوستان کی پرانی بیماری ہے، ایک قلم سترک ہو گئی۔ مسلمان مرد و عورت کا ہر مسلمان عورت سے بلا روک ٹوک شادی کر سکتا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں میں بھی ہندو ہونا کافی ہے۔ ایک ذات کا ہونا ضروری نہیں۔ برہمنوں کے گھروں میں پانسیں اور بانوں کے گھروں میں برہمنیاں موجود ہیں۔

یہاں ٹھگ وہ ٹھگ ہیں اور چوروہ ہیں کہ آنکھوں کا کابل چرائیں۔ یہاں شعبہ باز بازی گر، بہرو پیے، بھنڈیے، نقال، ہڑے، نٹ، طوائف، میرانی گوینے اور ہر فن کے نیک بد موجود ہیں۔ نیک اور اچھے لوگوں کا بھی یہ حال ہے کہ کوئی جزیرہ ایسا نہیں جس میں مولوی، پنڈت اور درویش موجود نہ ہوں۔

مدراسی اور جنگالی سونگھی مچلی بھی بڑے مزے سے کھاتے ہیں۔ اس سونگھی مچلی کو جس سے شرے ہوئے چڑے کی سی بو آتی ہے، عمدہ سے عمدہ گوشت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اسی طرح یہاں برہما اور پھین کے لوگ بیٹنی کھاتے ہیں۔ پھلیوں کو میوؤں میں بجا کر کھانے سے جبان میں کیرٹے پڑ جاتے ہیں تو ان کی زبان اور منہ مچلیوں کو کھانے کی پٹنی بناتی جاتی ہے۔ اس میں ایسی بدبو ہوتی ہے کہ ہم لوگ ہوا کے رخ ایک میل پر بھی اس کی بدبو برداشت نہیں کر سکتے مگر برہما اور پھین

کے لوگ اسے برآمدہ کھانے پر گرم مصالحہ کے طور پر پھڑک کر کھاتے ہیں اور بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ جب انہیں مینی مل جائے تو سمجھتے ہیں دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت مل گئی۔ طوائف کی عام دوکانیں گویا نہیں لیکن اکثر عورتیں ایسی بے حیا اور فاحشہ ہیں کہ کسبیل کو بھی ان سے شرم آتی ہے۔

نجر سے معلوم ہوا کہ ہر کسی کو اپنی وضع، رسم، بولی، لباس اور خود اک پسند ہے۔ جنگلی اپنے جنگل میں رہنے، ننگ و صرنگ چلنے پھرنے اور کیرٹے مکوڑے کھانے کو ہماری قبا اور دو شالوں اور زردہ و پلاؤ پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے کھانوں سے ان کو کتے ہونے لگتی ہے، ہمارے کپڑے پہننے سے انہیں تکلیف ہوتی ہے یہی ہمارے ہنر سے۔ برہما اور چھین کے لوگ ہمارے گھی کے کوان کو دیکھ کر ناک بند کر لیتے ہیں۔ ہمارے قیلے، قورے اور پلاؤ کے بھکارے عرب کا دماغ پرانندہ ہو جاتا ہے۔ انگریز ہمارے محل کو نہیں سونگھ سکتے۔ الغرض بچپن سے نبلن اور تاک جس چیز کی مادی ہو جاتی ہے، اسے صرف وہی پسند ہے۔

۹ نومبر ۱۸۸۳ء کو جب میں رخت سفر باندھنے کو تھا تو میں نے ایک عام دعوت کر کے اپنے سب دوستوں کو اس میں مدعو کیا۔ دعوت نامہ کی پیشانی پر میں نے لکھا تھا کہ :-

”یہ خاکسار اٹھارہ برس کے قیام کے بعد اب بظاہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان جا رہا ہے۔ امید ہے آج میرے تمام کرم فرما جن کے سوا گرامی درج ذیل ہیں، قدم رنجہ فرما کر خاکسار کے ساتھ آخری ماحضر تناول فرما کر مشکور و ممنون فرمائیں گے۔“

جس کسی کو بھی یہ دعوت نامہ موصول ہوا، بلا تکلف چلا آیا۔ یہ دعوت میرے مگر پر میرے دوا نہ ہونے سے صرف ایک گھنٹہ پہلے قبل از دوپہر ہوئی تھی۔ میری جدائی کی وجہ سے حاضرین میں سے ہر ایک کی آنکھوں سے اشک جاری تھے۔ بہت سے احباب اس مجلس میں کچھ تقریر

نہی کرنا چاہتے تھے مگر وہ لفظ کہنے کے بعد کسی کی ہچک نہ دھ جاتی تھی میں خود بھی ایک نصیحت آمیز لمبی چوڑی تقریر کرنا چاہتا تھا لیکن ایک غلط فہمی نہ کر سکا اور دل کے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔

اس دن اتفاق سے جموں المبارک تھا۔ تناول طعام مولانا لیاقت علی الہ آبادی

اور مولانا لیاقت علی کے ساتھ آخری نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد گاڑیاں تیار کھڑی تھیں۔ میں لواحقین کے ساتھ سوار ہو کر روس چلا آیا۔ صوبہ ہمدون میں مجھے روس تک الوداع کرنے میرے ساتھ آئیں۔ جب چار بجے شب بیوی بچوں کے ہمراہ کشی پر سوار ہوا تو بے شمار خلعت خوشی اور رنج کے بے نیلے جذبات کے ساتھ زار زار رو رہی تھی۔

اس وقت بیوی اور آٹھ بچے قریب رات تھے اور آٹھ بجے کے قریب میرے پاس جائیداد تھی۔ اس وقت میں اس کیفیت پر نہایت تجب کا اظہار کر رہا تھا کہ جب ۱۱ جنوری ۱۹۶۶ء کو اسی گھاٹ پر جہاز سے اترتا تھا تو میں نے لنگوٹی باندھ رکھی تھی اور تنہا تھا اور اب جب کہ اس رنج اور محن کی جگہ سے جہاز اترتا تو بیوی، آٹھ بچے اور آٹھ ہزار روپے کی جائیداد میرے پاس تھی۔ قدرت الہی کی کرشمہ سازی ملاحظہ فرمائیے کہ حکام دنیا نے مجھے بے ٹانگا کر کے سخت سزا کے لیے یہاں بھیجا تھا مگر اس حاکم حقیقی نے جس کے قبضہ تصرف میں دنیا و مافیہا کا انتظام ہے دشمنوں کے ہاتھ سے میرے ساتھ کتے اچھے سلوک کر کے۔

یہ جہاز جس پر سوار ہونے کے لیے میں تیار تھا بالکل اسی جگہ کھڑا تھا جہاں وہ جہاز جہاز لنگر انداز ہوا تھا جس پر میں آیا تھا۔ اس دن صبح کے وقت جہاز سے اترتا تھا اور آج شام کو سوار ہو رہا تھا۔ میں نے اس جزیرہ میں زندگی کی اٹھارہ بہاریں بسر کیں لیکن آج یہ سب کچھ مجھے ایک خواب معلوم ہو رہا تھا اور چشم تصور سے یہاں محسوس ہو رہا تھا گویا آج ہی صبح جہاز سے اترتا تھا اور شام کو سوار ہو رہا ہوں۔

میں نے چلنے سے چند روز پہلے زادِ رام کے سوا اپنی کل جائیداد شرعی حصوں کے مطابق

اپنی دونوں فیلیوں تقسیم کر دی اور خود دولت دنیا سے بیکردش ہو گیا۔ اب میری ذاتی جائیداد چند کتابوں اور چند جڑے پتروں کے سوا اور کچھ نہیں

شام کے پانچ بجے کے قریب ہم نے ہمارا فی الفور ہندوستان کو روانگی

پر سوار ہو کر ایک جگہ ڈیرہ ڈال لیا اس جہاز پر ہمارے علاوہ اور بھی بہت سی رانی حاصل کرنے والے مرد و عورتیں، یورپین اور ہندوستانی مسافر بھی سوار تھے۔ موسم نہایت خوشگوار اور سمندر پر سکون تھا۔ موبیل تھیں اور نہ تھیں۔ اس دن محرم کی اس تاریخ تھی۔ چودھویں صدی شروع ہو گئی تھی۔ غروب آفتاب کے وقت جہاز نے لنگر اٹھایا اور پتہ پُر آب کے ساتھ ہم نے جزائر انڈمان کو تیر باد لکھ کر پیچھے پھڑنا شروع کر دیا اب رات شروع ہو گئی تھی۔ چاندنی رات میں سمندر کی لہروں کا نظارہ بڑا فرحت بخش تھا۔ دوسرے دن جزائر جزیرہ کو کو میں پہنچ گیا۔ دو دن بعد کچھ بارش بھی ہوئی، جس سے مسافروں کو قدرے تکلیف کا سامنا کرنا پڑا، مگر جب جہاز تھوڑا سا اور آگے چلا گیا تو بارش ختم گئی اور تکلیف رفع ہو گئی۔

علی رضا نامی ایک مشہور تاجر نے جہاز پر ہماری خوب خاطر تواضع کی۔ دونوں وقت عمدہ کھانا، گوشت، پھل، چائے، کافی، برف، ہر قسم کے پھل اور مٹھائیاں ہمارے لیے لاتا۔ الغرض یہ سفر بڑے ہی راحت و آرام کے ساتھ طے ہوا۔

جب بارش کی وجہ سے سب مسافر تتر بتر کانپ رہے تھے، اس وقت رانی پا کر جانے والے مسافر نور الدین کی عورت کو دردِ ذہن شروع ہوا۔ اس حالت میں کہ زچہ پانی کانپ رہی تھی، اس کے ہاں پلوٹھے بچے نے جنم لیا اور اس دن تو بے چاری کو مشکل سے دال بجات ملا ہو گا مگر اسے یا اس کے بچے کو کوئی تکلیف نہ ہوئی بلکہ دونوں صحیح سالم اور تندرست تھے۔

کلکتہ | جب جہاز کلکتہ بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا، اس نو مولود بچے کی خبر نہ ہوئی۔

اس کی، والدہ بچے سیت زندانی ہوئی جہاز سے اتری اور پھر اس کے خاوند نے ٹکٹ لے کر لاہور لے گیا اور زچہ و سچ خوش و غرم لاہور روانہ ہو گئے۔ سمندر میں جہم لینے کی وجہ سے بچے کا نام بھی سمندر ہی رکھا گیا۔

چار دن اور چار رات کے سفر کے بعد اللہ کے فضل سے ہم ۱۳ نومبر ۱۹۸۳ء کو کلکتہ پہنچے۔ وہاں چھپا پازہ میں مولانا عبدالرحیم صاحب کے برادر مولانا عبدالرؤف صاحب کے گھر رہے۔ وہاں سے تیسری رات ہفت بجے ریل پر سوار ہوئے اور کلکتہ سے الہ آباد، کانپور، علی گڑھ اور سہارنپور کا منزل بہ منزل ٹکٹ لیتے ہوئے ۲۱ نومبر ۱۹۸۳ء کو بوقت ۹ بجے شب انبالہ کے اسٹیشن پہنچ گئے۔

انبالہ | کلکتہ سے دوپہا ہی اور ایک ناکہ ہمارے اہل دیال اور مال کی حفاظت کے لیے بطور اردلی انبالہ تک ہمارے ساتھ آئے تھے۔ انڈمان میں چونکہ سارا سال موسم معتدل رہتا تھا۔ اس لیے انہوں نے پہلے کبھی گرمی سردی کو نہ دیکھا تھا۔ ہم چونکہ نومبر کے آخر میں کلکتہ میں آئے تھے اس لیے سردی سے انہیں قدرے تکلیف بھی ہوئی لیکن پھر آہستہ آہستہ عادی ہو گئے۔

ہر موسم میں جگہ جگہ کپانی اور طرح طرح کے پھل کھانے کی وجہ سے میرے بیوی بچوں کی طبیعت نہایت شاداں و فرحاں تھی۔ پورٹ بلیئر سے انبالہ تک کا سفر نہایت خوشگوار رہا۔ ہر دن عید اور رات شب بزم کی کیفیت رہی۔

ایک دن وہ تھا کہ ہم ۲۲ فروری ۱۹۸۵ء کو انبالہ جیل سے زیور آہنی جو گیارہ لباس اور گھیر سیاه سے آراستہ و پیراستہ ہو کر انبالہ پولیس کے زیر حراست مغرب کو روانہ ہوئے تھے اور بڑے آرام و مصائب کا تختہ مشق بنے ہوئے گیارہ ماہ میں انبالہ سے کالا پانی پہنچے تھے اور ایک دن یہ ہے کہ ہم بڑے آرام و آسائش کے ساتھ دریائی سفر طے کر کے کلکتہ پہنچے اور وہاں سے ریل کے سپیشل درجہ میں بلا شرکت غیرے اپنے ہی دس افراد پر

مشتمل خاندان کو لے کر انبالہ آئے۔ نقد و جنس اور عمدہ لباس کو دیکھ کر چوڑا ب منہم ہوتے تھے۔ پورٹ بلیئر تھیک گیارہ دن بعد انبالہ پہنچ گئے۔

میری اس کیفیت، شان، اولاد اور مال، منال ہو دیکھ کر بڑے قہقہے کا اظہار کرتے تھے۔ درست خوش تھے اور دشمن ناخوش۔ راستہ میں جہاں بھی اترتا تو ہر شہر کے مسلمان میرا نام اُن کی میری ملاقات کے لیے دیوار و دروازے پر آتے تھے اور میری کیفیت دیکھ کر کہتے تھے کہ اللہ جل جلالہ بڑا قادر ہے، وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ جو بھی میری حالت سے واقف تھا وہ کہتا تھا کہ تمہارا اس ملک میں اس شان آنا، مردے کے زندہ ہونے سے کم نہیں، جو اس کرامت کو دیکھ کر ایمان نہ لائے وہ دل اور آنکھوں دونوں کا اندھا ہے ذرا غور فرمائیے یہاں مجھ سے ایک بیوی چھوٹی تھی، کالا پانی میں دو بیویاں عنایت ہوئیں۔ یہاں دو بچے چھوٹے تھے وہاں آٹھ مرحمت ہوئے۔ اسی طرح مال و اسباب اور نقد و جنس ہر ایک کا اللہ تعالیٰ نے مجھے نعم البدل عنایت فرمایا، جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق قرآن مجید میں آیا ہے:

وَإِنِّي لَأَشْكُو إِلَىٰ رَبِّكَ وَرَبِّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ۚ وَمَا يُغْنِي عَنْكَ كَثْرَتُ ثَمَارِكَ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۚ

وَرَبِّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ۚ وَمَا يُغْنِي عَنْكَ كَثْرَتُ ثَمَارِكَ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۚ

يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ۚ وَمَا يُغْنِي عَنْكَ كَثْرَتُ ثَمَارِكَ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۚ

یہ آیت میرے اوپر بھی من و عن صدق آتی ہے مگر میرے اس قصہ سے جو آیات الہی میں سے ایک بڑی روشن آیت ہے، صرف عابدین و صالحین ہی کو عبرت و نصیحت ہو سکتی ہے، منکرین و منافقین کو نہیں۔

انبالہ | دوسرے دن فجر کے وقت ہم انبالہ شہر پہنچے اور وہاں کے حکام سے اجازت لے کر اپنے آقا کے قدیم کپتان ٹیل صاحب کی خدمت میں ملے ہوئے۔ جب میں کپتان ٹیل کے بنگلہ پر گیا تو وہ دوڑ کر میرے ملنے کے لیے باہر آئے

اور اندر لے جا کر مجھے ٹوٹے پر بٹھایا اور نہایت تسلی و شفقت کی اور فرمایا کہ آج سے بیس روپے ماہوار تنخواہ آپ کو اپنی جیب سے دیا کروں گا اور آپ کی ملازمت کے لیے بھی جلد ہی کوئی اچھا انتظام کروں گا۔

کپتان ٹیل کی کوشش سے بہت سے انگریز مجھ سے پڑھا کرتے تھے میرے یہاں پہنچنے سے سو ابس بعد تک کہاں نے پچاس روپیہ ماہوار کا سیرے لیے انتظام کر دیا تھا۔ اپریل ۱۸۸۶ء کو جب وہ یہاں سے گئے تو یہ سلسلہ ختم ہو گیا بلکہ پولیس نے میری نگرانی شروع کر دی اور مجھ پر سختی بھی بڑھادی گئی۔

انبالہ پہنچنے کے بعد جب میں نے اپنے اس میں سالہ معمر کی ہندوستان کے نقشہ کی مدد سے پیمائش کی تو معلوم ہوا کہ انبالہ سے براستہ لاہور و بجٹی کالا پانی تک اور کالا پانی سے براستہ گلگتہ انبالہ تک سات ہزار میل مسافت بنتی ہے اور اس سفر میں ہندوستان کے بعض شمالی اضلاع کو چھوڑ کر تقریباً پورے ملک کا طواف ہو گیا۔ انبالہ کے صدر بازار میں میں نے ایک مکان کرایہ پر لے لیا اور اہل و عیال سمیت اس میں سکونت اختیار کر لی۔

دہلی جب گھر کے لیے سب ضروری سامان خرید لیا تو ۱۱ دسمبر ۱۸۸۳ء کو ایک ہفتہ کی رخصت لے کر بذریعہ ریل دہلی گیا۔ وہاں ایک رات رہ کر دوسرے

دن بذریعہ یکہ پانی پت پہنچا۔ اتفاق کی بات ہے پورے بیس برس قبل جب میں پانی پت سے دہلی کی طرف بھاگ گیا تھا تو اس وقت بھی دسمبر کی تیرہ تاریخ تھی اور آج جب بیس برس بعد واپس آیا تو دسمبر کی تیرہ تاریخ ہی تھی۔ وہی سڑک، وہی موسم اور وہی تاریخ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ میں آج صبح ہی بیوی بچوں کو چھوڑ کر دہلی گیا تھا اور آج ہی واپس آگیا ہوں

پانی پت مغرب کی نماز کے بعد پانی پت میں اپنے گھر پہنچا۔ میری بیوی اور لڑکے مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ فراس کے دن جو کچھ چند دن کا تھا اب بیس برس کا ہو چکا تھا۔ پانچ دن ٹھہرنے کے بعد براستہ کرناٹک ٹھانیسرا چلا گیا اور ایک رات

اور چند گھنٹے تھا میسر میں قیام کرنے کے بعد پھر انبالہ لوٹ آیا۔

جس جس شہر میں بھی یہ ماجز گیا، ہزاروں خست میری آمد کی خبر سن کر میری ملاقات کے لیے آتی تھی۔ تھانیسریں تو اس قدر اثر و بام خلاق ہوا کہ میں اس رات سو بھی نہ سکا اور بوند کی تنگی کی وجہ سے بہت سے لوگ میری ملاقات سے محروم رہ گئے۔ انبالہ میں تو کئی مہینوں تک دور دراز سے آنے والے لوگوں کا اتنا بندھا رہا۔ لوگ میرے منہ کو دیکھ کر خدا کی قدرت پر تعجب کرتے تھے۔

تھانیسرا ۱۳ دسمبر ۱۸۸۳ء کو جب میں نے تھانیسرا سے قدم اٹھایا، اس پر زوال شروع ہو گیا۔ بیس سال میں آبادی ساتویں حصہ سے بھی بہت کم رہ گئی۔ مکانات منہدم ہو گئے، گلی کو چھ مسدود ہو گئے اور انسانوں کے بجائے ہندوؤں نے کھنڈرات کو اپنا مسکن بنانا شروع کر دیا لیکن خدا تعالیٰ نے قرآن سے مجھے معلوم کرا دیا کہ یہ شہر چر و بار نہایت دھوم دھام سے آباد ہو گا۔

تھانیسرا میں میں نے اپنے مولد و مسکن پر بنا کر مالک مکان سے جو اس وقت اس میں آباد تھا، منت سماجت کر کے یہ اجازت چاہی کہ مستورات کو کسی ایک کمرہ میں الگ کر دو اور مجھے مکان کے اندرونی قطعات کی زیارت کر لینے دو۔ مالک مکان نے مجھے پہچان یا، نہایت اخلاق سے پیش آیا اور اس نے مجھے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اس جگہ بھی مجھے قدرت الہی یاد آئی کہ جس مکان کو میں نے ہزاروں روپے صرف کر کے تعمیر کیا تھا، اس میں اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہیں کھ سکتا تھا۔ خدا سے اتنی ہے وہ اس مکان کو قبول رکھے۔ اس کے بجائے نئے آفت میں مکان غنایت فرمائے۔ اب اللہ تعالیٰ کے چند نعمات کا تذکرہ کرتے ہیں بیس سالہ سرمد شہر کو ختم کرتا ہوں۔

الغامت الہی اللہ تعالیٰ کا مجھ پر سب سے بڑا نعم ہے کہ تاریخ قید سے لے کر آج تک میں جہاں اور جس جگہ رہا اس نے مجھے اپنے سایہ

حافظت میں رکھا۔ بیس برس میں ایک دن بھی مشقت کرنے کی نوبت نہ آنے دی۔ کالا پانی پینے سے پہلے ہی اس نے میری راحت کے سامان فراہم کر دیئے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی مجھے ایک بڑا سرکاری ہمدہ مل گیا۔ کالا پانی پینے سے فقط چار پانچ سال قبل ان جزار کا آباد ہونا، پورٹ بلیر کے قیدیوں کے قوانین میں نرمی و آسانی، ہمارے پینے سے قبل جنگل کی صفائی اور ملک امراض کا خاتمہ، بیس برس تک بڑے آرام و آسائش سے زندگی بسر کرنا اور ایسی مایوس کن جگہ سے حکام بالا کے تعصب کے باوصف شان و شوکت اور مال و اولاد کے ساتھ یسوع و مسیح کے پیچھے بھی بہتر حالت میں واپس آنا یہ سب میرے مولائے مجھ پر انعامات نہیں تو اور کیا ہیں؟

ہندوستان واپس آنے کے بعد، آب و ہوا کی سخت تبدیلی کے باوصف میرے بچے تندرست ہیں۔ بلکہ یہاں اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے دواور بچے بھی عطا فرمائے حالانکہ دوسرے لوگوں کے بچے جو کالا پانی سے آئے تھے یہاں آکر بہت کم بچے۔ اس علاقے میں جب بھی کوئی متعدی مرض پھیلتا ہے، میرا گھر محفوظ رہتا ہے۔ میرے یہاں پینے کے بعد یہاں بارش و باران بھی بکثرت ہونے لگ گئی ہے اور غلہ بھی نہایت اڑاں ہو گیا ہے۔

جب بیس برس بعد میری رہائی ہوئی تو تعاضاے بشریت کے مطابق مجھے بھی یہ فائدہ من کبر تھا کہ ہندوستان بیکرکھوں رہوں گا اور کیا کروں گا۔ کیونکہ تھاں میرے مکانات اور اراضی وغیرہ کو ملو سے بچتی سرہ رستہ کر کے ضیاع کر دیا تھا اور ضلع انبالہ کے حکام ہمارے وہی پرانے رفیق تھے، جنہوں نے کالا پانی بھیجا تھا۔ اس تردد اور انتشار کے وقت میں اس قادر کریم اور مقرب القلوب نے پستان ٹیل کے دل میں میرے لیے ہمدومی کے جذبات پیدا کر دیئے۔ وہ میری واپسی کے ابتدائے میں جب کہ ہر انگریز میری صورت سے متنفر تھا، میری طرف سے مدتوں بطور وکیل رٹا رہا اور اس نے وہ جگہ وغیرہ کی طرف سے بھی مجھے فارغ البال کر دیا۔

ریاست ارنولی میں ملازمت

جب ٹیل صاحب یہاں سے تبدیل ہو کر چلے گئے تو انہوں نے میری درخواست کے بغیر خود بخود ریاست ارنولی میں میرے لیے معقول روزگار کا بندوبست کر دیا، جہاں میں اب تک بڑے آرام و آسائش کے ساتھ ملازمت کر رہا ہوں۔ یہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے محض غیبی طور پر میرے روزگار اور آسائش کے سامان غیر مسلموں کے ہاتھوں فراہم کرا دیئے حالانکہ بظاہر ان سے ہمدومی کوئی توقع نہ تھی۔

مکمل آزادی

ہندوستان واپس آنے کے بعد پولیس کی جو نگرانی متعین ہوئی تھی، وہ کپتان ٹیل نے اپنی ذمہ داری اور ضمانت سے موقوف کرا دی تھی۔ کپتان کی تبدیلی کے بعد بغیر کسی سفارش کے محض اللہ کے فضل سے ۶ فروری ۱۸۸۵ء کو سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب کی طرف سے سٹی نمبر ۱۸۸۵ موصول ہوئی جس میں ہر قسم کی پابندی اور نگرانی کے خاتمہ کا اعلان تھا حالانکہ میرے دیگر پانچوں اصحاب سجن مولانا عبد الرحیم وغیرہ سے ابھی تک نگرانی موقوف نہیں کی گئی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب میں بالکل آزاد ہوں، جہاں چاہوں رہوں اور جو چاہے روزگار اختیار کروں۔ کاروبار کے سلسلہ میں ہمیشہ لاہور اور کلکتہ آتا جاتا رہتا ہوں۔ ریاست ارنولی کے مقدمہ کی پیروی کے لیے ولایت بھی جانا چاہتا ہوں اور ارادہ ہے کہ انشا اللہ ڈاکٹر ہنٹر اور دیگر موافق و مخالف اگمیزوں سے ملاقات کر کے اس قدرت الہیہ کو سے اعتراف کراؤں گا۔

جب میں انبالہ کچھ ہی کے اس مقام کو دیکھتا ہوں، جہاں مجھے چارٹی کا حکم سنایا گیا تھا یا جب انبالہ جیل کے پاس سے نکلتا ہوں، وہاں ڈیڑھ برس تک پس دیوار زنداں پابند زنجیر و سلاسل رہا، یا ان ٹکڑوں پر گزرتا ہوں، پچاسی کا حکم سنانے کے بعد جس سے چوتھے ہوئے جیل خانہ لے گئے تھے، تو قدرت الہیہ کو دیکھ کر میرا دل ہل جاتا ہے اور خیال کرتا ہوں

کہ جس دن مجھے چمانسی کا حکم سنایا گیا، کسے گمان تھا کہ کبھی میں ان مقامات اور مٹرکوں پر بے روں ٹوک چل سکوں گا۔ ہرگز ہرگز نہیں کسی فرد بشر کو بھی یہ گمان نہ تھا۔

یہ فقط اس رب قدیر کا کام ہے کہ اس نے زمانے کے یہ سب گرم و سرد تماشے دکھا کر پھر اپنے نالائق اور مغرور غلام کو اس ملک میں دوبارہ آباد کر دیا ہے اور پہلے کی نسبت وہ چند لوگوں کی آنکھوں میں معزز اور ممتاز بنا دیا ہے۔ وذلک فضل اللہ یوتیک من یشاء۔

اس قصہ کو محض ایک کہانی یا ایک فوجداری مقدمہ کا ترجمہ ہی نہ سمجھو بلکہ یہ قصہ خاتمہ تو آیات الہی میں سے ایک بڑی روشن آیت ہے۔ خداوند تعالیٰ قرآن مجید میں ایسے ہی قصوں کے متعلق فرماتے ہیں :-

لقد کان فی قصصہم عبرۃ لاولی

ان کے قصے میں عقلمندوں کے لیے

عبرت ہے۔

الالباب -

اور یہ میں نے زیب داستان کے لیے سپرد قلم نہیں کیا بلکہ ارشاد خداوندی :-
واما بنعمۃ ربک فحدث
اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہنا
کی تعمیل ہے۔

میں نے اللہ رب العالمین جل جلالہ وکرم نوالہ کے جملہ انعاماتِ ظاہری و باطنی کو نہایت اختصار کے ساتھ لکھ کر آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب آخر میں یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس محنت و مشقت اور تکالیفِ قید کو ریاسے پاک کر کے قبول فرمائے اور قارئینِ کرام کو اس قصہ سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔ اللہم انا نجعلک فی خورہم و نعوذ بک من شرہم۔

